U4513. 17-12-09

Title - KHUTBAAT-E-ABDUL HAQ

Creator - Abdul Haq

Publisher - Anjuman Taraqqi Urdu (Delhi).

Date - 1939

Pages - 172

Subjects - Khutbaat-o-Taqareer - Abdul Haq; Hindustani - Zuban; Urdu Zuban

خطبات عبدالحق

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقّی اُردو (ہند) نمبر ۱۲۴

خطباتِ عبدُالحق

یعنی

جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بالقابہم سیکرٹری انجمن ترقّی اُردو (ہند)

کی

بعض پُرمغز اور یادگار تقریروں کا مجموعہ

شایع کردہ

انجمن ترقّی اُردو (ہند) دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقیِ اردو (ہند) نمبر ۱۲۴

خطباتِ عبدالحق

یعنی

جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بالقابہم سیکرٹری انجمن ترقیِ اردو (ہند)

کی

بعض پُرمغز اور یادگار تقریروں کا مجموعہ

شایع کردہ

انجمن ترقیِ اردو (ہند) دہلی

۱۹۳۹ء

خانصاحب عبداللطیف نے لطیفی پریس دہلی میں چھاپا

اور

منیجر انجمن ترقیٔ اردو (ہند) نے دہلی سے شائع کیا

فہرست خطبات

عنوان	نمبر صفحات

پیش لفظ

ڈاکٹر مولانا عبدالحق صاحب مدظلہٗ لائف آنریری سیکرٹری انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) کے خطبات جو انھوں نے مختلف موقعوں پر دیے خاص اہمیت رکھتے ہیں ان میں سے بعض خطبات رسالۂ "اردو" میں شائع ہو چکے ہیں اور کچھ دوسرے بلند پایہ رسائل میں۔ لیکن بعض خُطبے جو الگ شائع ہوئے اُن کی مانگ اس قدر تھی کہ دفتر سے فرمائشوں کی تعمیل مُحال ہوگئی۔ اربابِ شوق کا یہ اصرار دیکھ کر ہم نے فیصلہ کیا کہ جس قدر خطبات فی الوقت مل سکیں اُنھیں جمع کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ مجموعہ پیش ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ بہی خواہانِ اُردو کے لیے یہ خُطبے مفید اور بصیرت افروز ثابت ہوں گے اور تاریخ ادبِ اُردو کے طلبہ خصوصیت کے ساتھ ان سے استفادہ کریں گے۔

دہلی - ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۹ء

مُرتّب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبۂ صدارت انڈین اورینٹل کانفرنس

{یہ خطبہ انڈین اورینٹل کانفرنس منعقدہ بڑودہ (دسمبر ۱۹۳۳ء) میں بحیثیت صدر شعبۂ اردو پڑھا گیا}

حضرات!

سارے ہندستان میں زبانوں کا ایک نسا جال پھیلا ہوا ہے۔ دنیا کے کسی ملک میں اتنی زبانیں نہیں بولی جاتیں جتنی ہمارے دیس میں۔ اُتر والا دکھن میں اور دکھن والا پورب اور پچھم میں ایسا ہی اجنبی ہے جیسا کوئی ہندستانی افریقہ کے کسی خطّے میں۔ ندرت کے خیال سے اگر کوئی اس پر فخر کرے تو شاید بے جا نہ ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حالات میں یہ بھی ملک کی ایک بڑی بدنصیبی ہے۔ قومی اتحاد کے مستحکم کرنے اور قوموں کے بنانے میں زبان کا بھی حصّہ ہے۔ جہاں زبانیں اس کثرت سے ہوں جتنی یہاں ہیں، وہاں خیالات کی اشاعت اور باہمی اتحاد میں ضرور مشکل پیش آتی ہے اور یہ مشکل اس وقت ہمارے سامنے بھی ہے۔ لیکن اس افراتفری میں امید کی ایک جھلکی اس میں نظر آتی ہے کہ انھیں زبانوں میں ایک ایسی بھی ہے جو ملک کے مختلف حصّوں میں بولی جاتی اور اکثر حصّوں میں سمجھی جاتی ہے اور اس کے بولنے والوں کی تعداد بھی اس قدر کثیر ہے

کہ ہندستان کی کسی اور زبان کو نصیب نہیں۔ اِسے اب آپ اردو کہیے یا ہندستانی۔ زبان کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے اور نہ اس کی کوئی قوم اور ذات ہوتی ہے۔ اُردو کی سرشت اور ساخت اس قسم کی ہے اور اس کی نشو ونما اس ڈھنگ سے ہوئی ہے کہ وہ بلا لحاظ قوم و ملت تقریبًا سارے ہندستان کی زبان ہے یا ہوسکتی ہے۔

اردو مخلوط زبان ہے

یوں تو دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس میں غیر زبانوں کے لفظ نہ پائے جاتے ہوں کیونکہ کوئی قوم دنیا میں بالکل الگ تھلگ نہیں رہ سکتی؛ دوسری قوموں کے میل جول سے لامحالہ کچھ نہ کچھ لفظ ان کی زبان کے آہی جاتے ہیں؛ لیکن قطع نظر اس کے بعض زبانیں ایسی ہیں جو دوسری زبانوں کے اثر اور میل سے کھچڑی بن گئی ہیں۔ یہ مخلوط زبانیں کہلاتی ہیں۔ ایک زمانے تک علمائے لسانیات کو مخلوط زبانوں کے وجود سے انکار رہا لیکن مابعد کی تحقیقات نے قطعی طور سے ثابت کردیا ہے کہ ایسی زبانیں موجود ہیں۔ انھیں میں ہماری زبان اردو کا شمار ہے۔ خود ریختہ کا لفظ جو پہلے اردو کا معروف نام تھا، اس خیال کی تائید کرتا ہے۔

مخلوط زبان کے وجود میں آنے کے متعدد اسباب ہوتے ہیں منجملہ ان کے ایک کشورکشائی ہے، یعنی ایک ملک یا قوم کا دوسرے ملک یا قوم کو فتح کرنا۔ ہماری مخلوط زبان کا ابتدائی تعلق اسی سے ہے۔ اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو جیسے آریاؤں کا ہندستان میں آنا کہ وہ بالکل یہاں منتقل ہوگئے یا ان کے مختلف قبائل فاتح کی حیثیت سے آگے پیچھے مسلسل طور پر یہاں آکر بس گئے۔ دیسیوں کو یا تو مار بھگایا، غلام بنالیا یا اپنے میں جذب کرلیا۔ ملک کے بڑے حصّے پر انھیں کی زبان چھاگئی اور بعد میں اس سے بگڑ بگڑا کر یا خلط ملط ہوکر دوسری پراکرتیں پیدا ہوگئیں۔ یا جیسے اہلِ یورپ کا امریکہ یا

آسٹریلیا پر مسلّط ہوجانا، جہاں انھیں کی زبان کا بول بالا ہو اور سب ایک ہی زبان بولتے اور پڑھتے لکھتے ہیں۔ دوسری صورت مسلمانوں کی آمد کی ہو، وہ بھی آریاؤں کی طرح فاتح کی حیثیت سے آئے۔ ان کی تعداد اہل ملک کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ وہ فارسی بولتے تھے اور اہل ملک ہندی۔ ان حالات میں جیسا کہ دستور ہو کاروباری، ملکی اور معاشرتی ضرورت سے مسلمان بول چال میں ہندی الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کرتے تھے اور ہندو فارسی الفاظ۔ کچھ عرصے تک تو مسلمانوں کا تعلق اپنے اصلی ملک سے رہا لیکن رفتہ رفتہ یہ تعلق کم ہوتا گیا اور وہ یہیں کے ہوگئے۔ اس تعلق کے استقلال کے ساتھ اس زبان کو بھی استقلال ہوگیا۔ اگرچہ سرکاری درباری زبان فارسی تھی اور مسلمانوں کی تعلیمی زبان بھی یہی تھی لیکن نوکر چاکروں، بیوی بچوں اور ملک کے دوسرے لوگوں سے جو اس زبان سے واقف نہ تھے انھیں ٹوٹی پھوٹی ہندی ہی میں باتیں کرنی پڑتی تھیں۔ ادھر اہل ملک کی ایک بڑی تعداد ایسی تھی جس کا تعلق دفاتر اور دربار اور امرا وغیرہ سے تھا اور بہت سے ایسے تھے جو حلقۂ اسلام میں آگئے تھے وہ سب فارسی جانتے اور بولتے تھے لیکن اصل زبان ان سب کی ہندی ہی تھی۔ اس لیے اس مخلوط زبان کو بہت زیادہ تقویت پہنچتی اور دن بدن فروغ ہوتا گیا۔ ایک عالم لسانیات ٭ کا قول ہو اور بہت صحیح ہو کہ "غیر زبان جو کسی قوم کو سیکھنی پڑتی ہو مخلوط نہیں بنتی بلکہ اس کی اپنی زبان غیر زبان کے اثر سے مخلوط بن جاتی ہو"۔ بعینہٖ یہی حال مسلمانوں کے آنے کے بعد اس ملک میں ہوا۔ فارسی مخلوط نہیں ہوئی بلکہ ہندی فارسی سے مخلوط ہوکر ایک نئی زبان بن گئی اور ہندی میں فارسی مخلوط کرنے والے اہل ہند تھے۔

٭ Prof. Windisch

جب کبھی ہم غیر زبان کے سیکھنے یا بولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ ہماری اپنی زبان کا کوئی لفظ نہ آنے پائے ہماری کوشش ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہم اس زبان (یعنی غیر زبان) کو صحیح اور فصیح بولیں اور اس بات کی سخت احتیاط کرتے ہیں کہ ہماری گفتگو میں ہماری زبان کے الفاظ یا طرز ادا کا شائبہ نہ پایا جائے۔ مگر غیر زبان کے بولنے میں ہم جس بات سے اس قدر پرہیز کرتے ہیں، اس کا ہم اپنی زبان میں خیال نہیں کرتے۔ مثلاً انگریزی کا آج کل ہمارے ہاں عام رواج ہے۔ جب کوئی ہندوستانی انگریزی بولتا ہے تو اپنی گفتگو میں حتی الامکان کبھی اپنی زبان کا لفظ نہیں آنے دیتا اور جہاں تک ہوسکتا ہے اہل زبان کی تقلید کرتا ہے اور یہی نہیں بلکہ انگریزی لب و لہجہ کی نقل اتارنے کی کوشش کرتا ہے۔ برخلاف اس کے اپنی زبان میں گفتگو کرتے وقت بیسیوں انگریزی لفظ بلا تکلف استعمال کر جاتا ہے۔ یا تو اس سے اپنی مشیخت اور علمی فضیلت جتانی مقصود ہوتی ہے یا پھر وہ ناواقفیت یا کاہلی کی وجہ سے ایسا کرتا ہے۔ کاہلی ان معنوں میں کہ اسے اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ اپنی زبان میں ان کے مترادف الفاظ تلاش کرے۔ اس میں وہ کسی قدر مجبور بھی ہے۔ فاتح قوم کی زبان کے مطالعہ، لکھنے، بولنے اور سننے سے معمولی اور عام ضرورت کے لفظ بھی اس کی زبان پر اس طرح چڑھ جاتے ہیں کہ بلا ارادہ بھی اپنی زبان میں انھیں بول جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی ہے۔ وہ بعض حالات میں غیر زبان (یعنے فاتح قوم کی زبان) کے خاص خاص الفاظ اس لیے بھی استعمال کرتا ہے کہ اس کے خیال میں (اور یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے) ان لفظوں کے استعمال سے وہ اپنا مفہوم زیادہ خوبی اور قوت کے ساتھ سامعین کے دل نشین کرسکتا ہے۔ حالانکہ اسے علم ہے کہ ان الفاظ کے مترادف

اس کی زبان میں موجود ہیں مگر وہ انھیں استعمال نہیں کرتا، اس لیے کہ وہ جانتا ہو کہ ان سے کلام میں وہ زور پیدا نہیں ہوتا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ تیس چالیس برس پہلے سویلزیشن، ریفارم، پولٹیکل، سیلف ریسپکٹ وغیرہ وغیرہ الفاظ ہماری زبان میں عام تھے۔ اُن کے استعمال کرنے والے سب کے سب ان کے مترادف الفاظ سے ناواقف نہ تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ اپنے الفاظ سے پورا مفہوم جو وہ چاہتے ہیں اور جو ان انگریزی الفاظ میں موجود ہو، ادا نہ ہوگا۔ اب جو ہم ان کی جگہ اپنے لفظ استعمال کرنے لگے تو رفتہ رفتہ ان میں بھی وہی کس بل پیدا ہوگیا۔ ان سب باتوں سے غیر زبان (یا فاتح قوم کی زبان) کی فضیلت ثابت ہوتی ہو۔ فضیلت بھی کئی قسم کی ہوتی ہو لیکن طوالت کے خوف سے میں اس موضوع پر یہاں بحث نہیں کروں گا۔

جو عام اصول میں نے ابھی بیان کیا ہو وہ ہندستان کے اسلامی عہد میں حرف بحرف عمل میں آیا۔ ملکی تسلط کے وقت فاتح قوم کی زبان فارسی تھی۔ اُمرا اور بادشاہ، دربار اور دفتر میں رسائی کا ایک بڑا ذریعہ یہ زبان بھی تھی۔ جیسا کہ ہونا چاہیے تھا اور ہوتا آیا ہو، ہندوؤں نے فارسی سیکھنی شروع کی اور ایسی سیکھی کہ اُستاد ہوگئے اور ان میں سے بعض کا کلام یہاں تک مقبول ہوا کہ درس میں داخل ہوگیا۔ فارسی میں ہندو تعلیم یافتہ طبقہ کی ترقی نہایت حیرت انگیز اور قابل تعریف ہو۔ فارسی کا جاننا حصول علم اور ضروریات زمانہ ہی کی خاطر نہ تھا بلکہ فارسی، تہذیب و شائستگی کی علامت سمجھی جانے لگی تھی اور جیسا کہ دستور ہی، فیشن میں داخل ہوگئی تھی۔ متواتر مطالعہ، انشا و شعر و سخن کی مشق، سرکاری اور دفتری نوشت و خواند کی وجہ سے اہل ملک کی طبائع میں ایسی رچ گئی تھی کہ انھوں نے فارسی لفظ ملکی زبان

ہیں دھڑادھڑ داخل کرنے شروع کردیے۔ ایسے الفاظ کا داخل ہونا جو یہاں کے لیے نئے تھے یا ملکی زبانوں میں ان کے ہم معنی دستیاب نہیں ہو سکتے تھے، کچھ بیجا نہ تھا لیکن جب غیر زبان کے الفاظ کا استعمال عادت اور فیشن میں داخل ہوجاتا ہے تو پھر اس کی روک تھام مشکل ہوجاتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ روزمرہ کی ضروریات کے ایسے لفظ بھی جن کے ہم معنی اپنی زبان میں پہلے سے موجود ہوتے ہیں یا اُن کے مفہوم اپنی زبان کے ذریعہ ذرا سے ردّوبدل یا کسی اور طریقے سے بآسانی ادا ہوسکتے ہیں، زبان میں داخل ہوجاتے ہیں۔ گو یہ سلسلہ ایک لحاظ سے نا مناسب ہو، مگر اس سے زبان میں وسعت اور شوکت پیدا ہوجاتی ہے اور ادیب کے لیے ایک وسیع اور زرخیز میدان نکل آتا ہے جس میں اسے گوناگوں خیالات کے اظہار اور تخیل کی جولانی کا موقع ملتا ہے۔ مترادفات میں سے موقع و محل کے لحاظ سے ٹھیک لفظ کا انتخاب ادیب کا معمولی کام نہیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ خیالات کی مختلف باریکیوں اور معانی کی نزاکتوں کے لیے ایک ہی مفہوم کے مختلف پہلوؤں کے واسطے متعدد الفاظ موجود ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ اہل ملک کی بدولت فارسی عربی الفاظ بے ضرورت بھی داخل ہوگئے مگر اس سے ہماری زبان کے سرمائے میں بہت بڑا اضافہ ہوگیا اور اس اختلاط نے اردو میں وسعت، شوکت اور قوت پیدا کردی ہے۔ ہندی الفاظ دل نشینی اور اثر کے لیے اور فارسی عربی الفاظ شان و شوکت اور خاص خاص مضامین اور خیالات کے اظہار کے لیے اپنے اپنے موقع پر بڑا کام دیتے ہیں۔

انگریز بھی اس ملک کے فاتح ہیں اور ان کی زبان کا اثر بھی ہماری

زبانوں پر بہت ہؤا ہے اور ہو رہا ہے لیکن وہ ہمیشہ ہم سے الگ رہے اور آخر تک وہ فاتح اور ہم مفتوح بنے رہے ۔ مسلمان بھی فاتح تھے لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد وہ یہیں کے ہو گئے اور ان کے بے تکلف میل جول اور معاشرت، ادب اور حکومت کی باہمی شرکت کی وجہ سے ان کی زبان نے ملکی زبان پر یہ اثر ڈالا کہ دونوں کے اختلاط سے ایک نئی زبان پیدا ہو گئی جو ان دونوں قوموں کے اتحاد و تہذیب کی بے نظیر یادگار ہے۔

جب اردو نے اپنی جگہ بنائی اور بول چال سے نکل کر ادب میں قدم رکھا تو ابتدا، جیسا کہ اکثر زبانوں کی ہوئی ہے، شعر و سخن سے ہوئی اور اس وقت الفاظ ہی نہیں بلکہ فارسی ترکیبیں، انداز بیان، تشبیہات و استعارات اور تلمیحات یہاں تک کہ بعض صرفی نحوی صورتیں بھی خود بخود اس میں منتقل ہو گئیں ۔ اس زمانے میں ہمارے اکثر شعرا فارسی اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، اس میں ہندو مسلمان دونوں شریک تھے ۔ رفتہ رفتہ فارسی کا زور کم ہوتا گیا اور اردو کو فروغ ہونا شروع ہؤا۔ مگر اس کی ساخت ہیئت وہی رہی جو قائم ہو چکی تھی ۔ جس طرح ہندوؤں نے فارسی میں امتیاز حاصل کیا تھا اسی طرح انھوں نے اردو میں بھی نام پیدا کیا جس کی شہادتوں سے ہمارا علم ادب بھرا پڑا ہے۔

غرض یہ کہ یہ زبان اسی ملک میں بنی اور اسی ملک والوں نے بنائی اور انھیں کی عطا کی ہوئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمان بھی ان کے ساجھی ہیں لیکن شریک غالب ہندو ہی ہیں ۔ اگر اس میں فارسی عربی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کی کثرت پائی جاتی ہے تو اس بدعت کے مرتکب بھی زیادہ تر ہندو ہی ہوئے ہیں ۔ اور اب جو یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ

اردو میں عربی فارسی الفاظ اور ترکیبیں بکثرت داخل کی جارہی ہیں تو (گستاخی معاف!) اس کا الزام بھی ہندی والوں ہی کے سر ہے۔ وہ اگر بحیثیت جماعت اس سے کنارہ کشی نہ کرتے تو یہ نوبت نہ آتی اور ان کی شرکت روک تھام کا کام دیتی اور وہی توازن قائم رہتا جو اس سے پہلے تھا۔

ایک وجہ اور بھی معلوم ہوتی ہے۔ جب تک دِلّی اُردو کا مرکز رہی ہندی کے دل کش الفاظ اس میں برابر داخل ہوتے رہے اور اب تک دلّی کے ادیبوں نے اس کی پابندی کی ہے۔ چنانچہ زمانۂ حال کے مصنّفین خصوصاً آزاد، حالی، ذکاءاللہ، نذیر احمد، نیز مرزا داغ نے سینکڑوں ہزاروں ہندی لفظ جو صرف زبانوں پر تھے اور مبتذل سمجھے جاتے تھے اور جنھیں ادب میں بار نہیں ملا تھا، اس خوبی سے اپنے کلام میں استعمال کیے ہیں کہ خاصے متین اور سنجیدہ معلوم ہوتے ہیں۔ جب یہ زبان دوسرے صوبوں اور علاقوں میں پہنچی تو وہ اس سے محروم ہوگئی اور خصوصاً انگریزی تعلیم کے اثر سے زبان میں جب نئے نئے خیالات آنے شروع ہوئے تو انھوں نے مجبوراً فارسی عربی الفاظ سے کام لینا شروع کیا پھر اکثر مُترجموں نے جو انگریزی تعلیم یافتہ تھے اور اپنی زبان پر پوری قدرت نہ رکھتے تھے، فارسی عربی الفاظ کے سوا انگریزی الفاظ کا بھی اضافہ کیا۔ (میں اس میں مسلمانوں کو بھی بری الذمّہ نہیں سمجھتا) لیکن اگر ہندی والے پہلے کی طرح شریک رہتے تو یہ افراط تفریط نہ ہونے پاتی۔ ان کی کنارہ کشی نے درحقیقت اردو زبان کو نقصان پہنچایا ہے۔ ہندو برابر کے دعویدار ہیں بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھ کر؛ یہ انھیں کی زبان ہے، اس کی ترقی واشاعت ان پر ایسی ہی لازم ہے جیسی اوروں پر جو اسے

اپنی زبان خیال کرتے ہیں۔ اب صرف ایک صورت ہوسکتی ہو کہ ایک ایسی
جامع اور مبسوط لغات مرتب کی جائے جس میں ہر قسم کے الفاظ جو اردو ادب
اور اردو زبان میں رائج ہیں، خاص اصول کے تحت جمع کیے جائیں اور
ان کے استعمال مثالوں کے ساتھ بتائے جائیں تاکہ پڑھنے والے کو معلوم
ہو کہ اس خزانے میں کیسے کیسے انمول موتی موجود ہیں جو ہماری غفلت سے
بیکار پڑے ہوئے ہیں اور جن کو کام میں لانے سے زبان کی رونق ہی نہیں
بلکہ قوت و وقعت بھی بڑھے گی۔ اور اسی پر بس نہ کیا جائے بلکہ اس نوعیت
کی متعدد اور بکثرت کتابیں تالیف کی جائیں تاکہ زبان ملک کے ہر کونے
میں پہنچ جائے اور ہر شخص اس کے صحیح استعمال پر قادر ہو جائے۔

کیا ہندی اُردو ایک ہیں؟

حضرات! آج کل اخباروں، تقریروں اور تحریروں میں یہ جملہ عام طور پر
سننے اور پڑھنے میں آتا ہو کہ ہندی اردو دونوں ایک ہیں صرف رسم الخط کا
فرق ہو۔ اس کے کہنے والے معمولی لوگ نہیں بلکہ بڑے بڑے قابل، ذمہ دار
اور واجب الاحترام بزرگوں نے بھی اس کا اعادہ فرمایا ہو۔ کیا یہ قول حقیقت پر
مبنی ہو؟ حقیقت پر پردہ ڈالنا یا جانتے ہوئے خاموش رہنا بھی اخلاقی جرم
ہو۔ اس لیے اگر میں اظہار حقیقت پر مجبور ہوں تو مجھے معاف فرمایا جائے گا۔
میں اس قول کے قائلین کو الزام نہیں دیتا، ممکن ہو کہ ان کے ذہن میں کوئی
ایسی بات ہو جس کی بنا پر وہ اسے حقیقت سمجھتے ہوں جس کا ہمیں علم نہیں،
لیکن موجودہ حالت میں میں اس کا قائل نہیں۔ یہ قول یا تو سیاسی مصالح پر
مبنی ہو یا ناواقفیت پر۔ جو دونوں زبانوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں
کہ یہ ایک نہیں۔ اردو کا اخبار یا رسالہ کسی ہندی داں کے سامنے پڑھیے
یا ہندی کا اخبار یا رسالہ کسی اردو داں کو سنایئے اور پھر دیکھیے کہ یہ دو

زبانیں ایک ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ یہ دونوں ایک ہوسکتی تھیں، لیکن اب روز بروز ان میں اس قدر بُعد پیدا ہوتا جاتا ہے کہ ان کا ایک جگہ لانا اور ایک کردینا اختیار سے باہر ہوگیا ہے۔ اس بُعد کو کم کرنے کے لیے بارہا یہ کہا جاتا ہے کہ اردو والے عربی فارسی کے ثقیل الفاظ سے اور ہندی والے اسی قسم کے سنسکرت کے الفاظ سے احتراز کریں۔ یہ مشورہ بہت معقول ہے لیکن عمل کرنا دشوار ہے۔ خود مشورہ دینے والے ہی عامل نہیں تو اوروں سے کیا توقع ہوسکتی ہے۔ انصاف سے دیکھیے تو ہم نہ اردو والوں کو الزام دے سکتے ہیں نہ ہندی والوں کو۔ مغربی تعلیم اور جدید حالات و تغیرات کی رَو میں ہر آن نئے نئے خیالات اور اسلوب بیان بہے چلے آرہے ہیں آخر ہم ان کو اپنی زبان میں کیوں کر ادا کریں۔ ہندی والا مجبور ہے کہ سنسکرت کے کوش اُلٹے پلٹے اور اردو والا عربی فارسی لغات۔ اس میں دونوں مجبور ہیں اور کوئی چارہ نہیں۔ الزام تو اس وقت دیا جاتا کہ ہم نے اُن کے لیے کوئی سہولت پیدا کی ہوتی اور وہ اس پر عمل نہ کرتے۔ دونوں ایک حمام میں ننگے نہا رہے ہیں، ایک کو دوسرے پر ہنسنے کا کوئی موقع نہیں۔ رہی "ہندوستانی"، جس کا آج کل بہت غلغلہ ہے اور جس کا ذکر خیر سیاسی اور معاشرتی تقریروں اور بسا اوقات تحریروں میں کیا جاتا ہے، وہ کیا ہے؟ کہاں ہے؟ اس کے لکھنے والے کون ہیں؟ اس کا تعیّن کبھی کسی نے کیا ہے؟ اس کا وجود سوائے معمولی بول چال اور کاروبار کے کہیں نہیں پایا جاتا۔ جب ہم ادبیات اور علم و فن کی سرحد میں قدم رکھتے ہیں تو یہ نہ ہندی میں نظر آتی ہے نہ اُردو میں۔ معمولی بات چیت اور سودا سلف کی بولی ادبی اور علمی زبان نہیں ہوسکتی

خصوصاً جب وہ تحریر میں آکر جھٹ اپنا روپ بدل دیتی ہی۔ ایک فریق کے ہاتھ پڑکر یہ ہندی ہوجاتی ہی اور دوسرے کے ہاں اُردؤ۔ اصل یہ ہی کہ اس مسئلہ پر اس نظر سے کسی نے غور ہی نہیں کیا اور نہ اب تک کوئی باقاعدہ اور متحدہ کوشش کی گئی ہی کہ کیونکر اس فرق کو مٹایا جائے اور اور اس زبان کو جسے ہم ہندوستانی کہتے ہیں کیونکر علم و ادب کے دربار میں پہنچایا جائے۔ میری سمجھ میں ایک تدبیر آئی ہی اور میں نے اس پر عمل بھی شروع کردیا ہی اور وہ یہ ہی کہ ہندی ادب میں اب تک جتنے عربی فارسی (یا اُردؤ) لفظ آئے ہیں یا ہندی بولنے والوں کی زبان پر ہیں وہ سب جمع کیے جائیں اور اسی طرح اردو ادب میں جس قدر ہندی الفاظ استعمال ہوئے ہیں یا اردو بولنے والوں کی زبان پر ہیں وہ بھی اکٹھے کیے جائیں اور ان سب کو ملاکر ایک لغات مرتب کی جائے۔ گویا یہ اردو ہندی زبانوں کے مشترکہ الفاظ اور محاورے ہوں گے۔ یہ کتاب ایک ایسی جماعت کی خدمت میں پیش کی جائے جو دونوں فریقوں کے نمائندے ہوں، وہ اس پر غور و بحث کریں اور اگر وہ اسے مستند قرار دیں تو کتاب شایع کردی جائے۔ نیز یہ جماعت یا اس کی مقرر کی ہوئی کوئی مجلس اس امر کی مجاز کی جائے کہ ہندی اردو زبانوں میں سے جن الفاظ کی ضرورت سمجھے اس میں اضافہ کردے اور نئے خیال یا مفہوم کے لیے باہمی مشورے سے جدید الفاظ تجویز کرے اور ان کا اعلان مناسب طریقہ پر ملک میں کردیا جائے۔ اگرچہ اس طرح سے اب تک کوئی زبان نہیں بنی لیکن ہمارے ملک اور ہماری زبانوں کی حالت بالکل مختلف ہی۔ علاوہ اس کے یہ کیا ضرور ہی کہ جو بات اب تک نہیں ہوئی وہ آیندہ بھی نہ ہو۔ یہ زمانہ

بدعت و جدّت کا ہے اور اس میں اس قسم کی بدعتیں بالکل جائز اور مستحسن ہیں - اگر یہ صورت عمل میں آجائے تو کچھ تعجب نہیں کہ اہل علم اور ادیبوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو جائے جو اس مشترکہ زبان کو رواج دینے پر آمادہ ہو جائے اور اپنے قلم کے زور سے اس کی حیثیت منوالے - اگرچہ ادیب یا شاعر پر کسی کا بس نہیں چلتا اور کسی کا کیا وہ خود اپنے بس میں نہیں ہوتا، تاہم یہ کوشش اُس کی بہت کچھ رہنمائی کرے گی، اور کچھ نہیں تو کم سے کم اس فرق کے کم کرنے میں بہت کام دے گی جو روز بروز بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور اگر چند اخبار اور رسالے اس زبان میں نکالنے شروع کر دیے جائیں تو ممکن ہے کہ اس کے رائج ہونے میں آسانی پیدا ہو جائے - اگر یہ صورت قابل عمل خیال نہ کی جائے تو پھر ان دونوں زبانوں کو اپنے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ باہمی رقابت اور مخالفت کی کوئی وجہ نہیں - ہندی کی اشاعت سے ہندی سیکھنے والے اردو سے اور اردو سیکھنے والے ہندی سے زیادہ قریب ہو جائیں گے کیونکہ ہندستان کی کوئی دو زبانیں باہم اتنی قریب نہیں جتنی ہندی اردو - اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کوئی شخص اردو زبان کا اعلیٰ ادیب اور محقق نہیں ہو سکتا جب تک ہندی نہ جانے اور اس طرح ہندی کا ادیب اور محقق ہونے کے لیے اردو کا جاننا لازم ہے - ان دو زبانوں کا بلا مبالغہ اور اصلی معنوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور اس لیے ایک دوسرے کی مخالفت لاحاصل ہی نہیں بلکہ مُضر ہے -

رسم الخط کا مسئلہ

رہا رسم الخط کا مسئلہ، تو اس کا حل بھی اسی وقت ممکن ہے جب کہ وہ صورت قابل عمل ہو جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے - اور یہ مسئلہ کچھ ہندی اردو ہی سے مخصوص نہیں بلکہ ہندستان کی تمام زبانوں سے متعلق ہے - اگر یہ

جھگڑا چُک جائے اور ہماری زبانوں کے حروف ایک ہوجائیں خواہ وہ رومن ہی کیوں نہ ہوں ، تو ہمیں ایک دوسرے کی زبان سیکھنے میں بے حد سہولت ہوجائے گی اور وہ ابتدائی دشواری جو آخر تک قائم رہتی ہے خود بخود اُٹھ جائے گی اور ہم ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوجائیں گے ۔ دوسرے کی زبان سیکھنے سے خود ہماری زبان پر نیز ہمارے دلوں پر اثر پڑتا ہے اور زبان کے ساتھ زبان والوں کی طرف سے دلوں میں اُنس اور ہمدردی پیدا ہوجاتی ہے ۔ ایک زمانہ آئے گا جب یہ مسئلہ اس قدر دشوار نہیں رہے گا جیسا کہ اب معلوم ہوتا ہے ۔

اردو زبان کا موجودہ رُخ

ماضی سے گزر کر ہمیں حال کی طرف دیکھنا چاہیے کہ اس پچیس تیس سال میں ہماری زبان کا رُخ کس جانب ہے ۔ دُور کے ڈھول سہانے معلوم ہوتے ہیں ۔ اکثر اوقات دُور کی بھونڈی چیزیں بھلی معلوم ہوتی ہیں ۔ انسان کسی قدر قدامت پسند واقع ہوا ہے ، گزشتہ میں اُسے وہ خوبیاں نظر آتی ہیں جو قریب ہونے کی وجہ سے حال میں نہیں دکھائی دیتیں ۔ لیکن حال سے غفلت کرنا اپنے مستقبل سے غفلت کرنا ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ ہم میں اس وقت سرسید ، آزاد ، نذیر احمد ، حالی اور شبلی جیسے انقلاب انگیز مصنف نہیں ہیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ انھیں غریب مزدوروں میں سے جو قصرِ ادب کے لیے اینٹ چونا تیار کر رہے ہیں ویسے ہی یا اُن سے بڑھ کر معمار پیدا نہیں ہوں گے ۔ اور یہ کیا ضرور ہے کہ حال کی رفتار اسی کینڈے کی ہو جو پہلے تھی ۔ ادب صنّاعی ہے ، صنّاعی میں (برخلاف فطرت) اعادہ محال ہے ۔ کسی شاعر میں کتنا ہی سوز و گداز کیوں نہ ہو ، میرؔ نہیں ہوسکتا ۔ کوئی کیسا ہی بلند فکر کیوں نہ ہو ، دوسرا غالبؔ ہونا ممکن نہیں ۔ بعد کے ادیب کے لیے

اس کے سوا چارہ نہیں کہ یا تو اگلوں کی راہ پر پڑے، جس میں سرسبز ہونا دشوار ہی یا اپنے لیے نئی راہ نکالے۔ یہی وجہ ہی کہ ادب کی راہ ہمیشہ صاف اور سیدھی نہیں ہوتی، اس میں بہت سے پیچ و خم ہوتے ہیں۔ اسی لیے اس کے جانچنے کے لیے ہر کونے کھدرے پر نظر دوڑانی چاہیے۔ چنانچہ اس زمانے میں بعض ایسی خصوصیات نظر آتی ہیں جو پہلے نہیں تھیں اور تھیں تو بہت کم۔ مثلاً چھوٹے فسانے لکھنے کا آج کل عام رواج پایا جاتا ہی۔ اگرچہ اس وقت سوائے منشی پریم چند کے جن کے بعض فسانے درحقیقت بے نظیر ہیں، کوئی ایسا نظر نہیں آتا جس میں وہ جدت ہو لیکن ان لکھنے والوں میں بعض بہت ہونہار ہیں جن سے توقع ہی کہ آگے چل کر نام پیدا کریں گے۔ دوسری چیز ادبی تنقید ہی جس کی ابتدا مولوی حالی نے کی اور اب اس فن پر متعدد لکھنے والے پیدا ہوگئے ہیں جن میں سے بعض اپنی زبان کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ یہ زیادہ تر مغربی تعلیم کا اثر ہی اور کم و بیش مغربی اصول پر کام ہو رہا ہی۔ شاید اسی کانفرنس میں بعض تنقیدی مقالے پیش کیے جائیں۔ اس وقت بھی ہم میں ایسے قابل نقّاد موجود ہیں جیسے پروفیسر شیرانی یا اور لوگ جنھیں ابھی شہرت حاصل نہیں ہوئی یا جو فی الحال اپنے کام میں مصروف ہیں جو حال کے ادب میں اپنی قابل قدر یادگار چھوڑ جائیں گے۔ تنقید صحیح ذوق کے لیے لازم ہی لیکن ایک نقّاد کے لیے جو اس کٹھن اور صبر آزما کام میں ہاتھ ڈالتا ہی وسیع معلومات، گہری نظر اور ذوق سلیم کی ضرورت ہی۔ صحیح تنقید مصنّف اور پڑھنے والے دونوں کے لیے مفید ہی۔ ہمارے دو چار رسالے اس منصب کو انجام دے رہے ہیں، اکثر بے پروائی کے ساتھ اور کبھی کبھی مستعدی اور قابلیت سے۔ حال کے انقلابات اور تغیرات سے ہمارا ادب بھی متاثر ہوا ہی

اور اس میں طرح طرح کی جدّتیں پیدا ہو رہی ہیں - ان کے جانچنے کے لیے پُرانے اُصول کام میں نہیں آسکتے۔ ان نئی چیزوں کے پرکھنے کے لیے ہمیں نئے اُصولوں سے کام لینا پڑے گا۔

اِس زمانے میں اُردو زبان و ادب کے متعلق ہمارے معلومات میں ایک جدید اضافہ ہُوا ہے۔ بعض محققین نے بڑی محنت اور تلاش سے قدیم اردو ادب کا پتا لگایا ہے اور بہت سی ایسی بے بہا اور نایاب کتابیں ڈھونڈھ نکالی ہیں جو اب تک گمنامی میں پڑی ہوئی تھیں - اس کی بدولت اُردو زبان کی زندگی میں تقریبًا تین سو سال کا اضافہ ہوگیا ہے اور اردو زبان و ادب کی تاریخ کے لیے ایک نیا باب کھل گیا ہے۔ یہ جستجو جاری رہی تو بہت سی نئی چیزیں ایسی دریافت ہوں گی جن کی امداد سے تاریخ ادب کے سلسلے کی بعض کڑیاں جو اب تک نہیں ملیں، ہاتھ آجائیں گی۔

شعر و سخن میں بھی اُردو زبان کسی سے پیچھے نہیں، اگرچہ اس وقت حالی سا کوئی انقلابی شاعر پیدا نہیں ہُوا، سوائے ایک شخص کے جس نے حقیقت میں اُردو شاعری میں جان ڈال دی تھی اور جس نے اپنی قوتِ کلام اور زورِ بیان سے زبان میں ایک نئی تازگی اور نیا جوش پیدا کردیا تھا، لیکن اس بدنصیبی کا کیا علاج کہ اقبال اُردو سے رُوٹھ گئے ہیں، تاہم ایسے نئے شاعر پیدا ہو رہے ہیں جن کا قدم آگے ہے اور اُردو شاعری میں نیا رنگ پیدا کرکے صناعی کا حق ادا کر رہے ہیں۔ زندگی کے عام حالات اور قدرت کے عجائبات سے ہماری شاعری کو جو ایک گونہ بےتعلقی سی تھی وہ اب رفع ہو رہی ہے۔ عنقریب زمانے میں انھیں میں سے بعض ایسے خوش گو شاعر نکلیں گے جن پر اُردو زبان فخر کرے گی۔ میں چاہتا تھا کہ چند نام

پیش کروں لیکن ابھی ان کے متعلق صحیح رائے دینے کا وقت نہیں آیا۔ بعض ان میں سے ایسے ہیں جو ابھی اُبھر رہے ہیں، اگر انھیں چھوڑ دوں تو ناانصافی ہوگی اور اگر نام لوں تو قبل از وقت ہوگا۔ لیکن وہ وقت دُور نہیں جب اُن کے نام پیش کرنے میں کوئی تامّل نہ ہوگا۔

تالیف و ترجمہ میں بھی ترقّی کے آثار نظر آرہے ہیں۔ بعض صاحبِ ذوق ذی علم محض اپنے شوق سے اس کام کو انجام دے رہے ہیں۔ ان میں خاص کر اہل پنجاب اور عثمانیہ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ نوجوان قابل تعریف ہیں جو ادب اور علوم و فنون کے مختلف شعبوں میں تالیف و ترجمہ کر رہے ہیں۔ تالیف و تصنیف کا پایہ ابھی ہماری زبان میں بلند نہیں ہے۔ ہم اس عہد کی (جو نوجوانوں کا عہد ہے) کوئی ایسی بلند پایہ تالیف یا تصنیف نہیں پاتے جسے دوسری زبانوں کے مقابلے میں دعوے سے پیش کرسکیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ شوق بڑھ رہا ہے اور تعداد بھی بڑھ رہی ہے اور یہ بہت اچھے آثار ہیں۔ ترجمے کو بعض اوقات حقارت سے دیکھا جاتا ہے لیکن ترجمہ کوئی معمولی کام نہیں ہے، اس میں اُسی قدر جان کاہی اور سر دردی کرنی پڑتی ہے جتنی نئی تالیف یا تصنیف میں۔ ترجمے میں وہی کامیاب ہوسکتا ہے جو مضمون پر حاوی ہونے کے علاوہ دونوں زبانوں میں کامل دسترس رکھتا ہو، ادب کی نزاکتوں سے واقف ہو اور اصل مصنف کے صحیح مفہوم کو اپنی زبان میں اسی قوت سے بیان کرسکے۔ یہ آسان کام نہیں اور ہر ایک کا کام نہیں۔ ترجموں سے زبانوں کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ یہی نہیں کہ ہمارے علم اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ خود زبان بھی اس سے متمتع ہوتی ہے۔ ایک اعلیٰ درجے کی تصنیف کا عمدہ ترجمہ بہت سی معمولی

تصنیفوں سے کہیں بڑھ کر مفید ہوتا ہے۔ وہ ادب کا جز ہو جاتا ہے۔ ہمارے ادب میں عمدہ ناولوں اور ڈراموں کی بہت کمی ہے۔ اگرچہ ان کا رواج پہلے سے زیادہ ہے لیکن ہماری زبان میں اب تک ایک بھی ایسا ناول یا ڈراما نہیں جسے ہم اعلیٰ پایہ کا کہہ سکیں۔ تصنیف تو درکنار کسی اعلیٰ پایۂ کے ناول یا ڈرامے کا عمدہ ترجمہ بھی اب تک نہیں ہوا۔ یہ امر نہایت قابل افسوس ہے۔

اس سلسلے میں چند ایسے اداروں کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو تالیف و ترجمہ کے کام میں مشغول ہیں۔ ان میں ایک انجمن ترقیٔ اُردو ہے جس نے ادب اور علوم وفنون کی کتابوں کے ترجمے اور تالیف کے علاوہ اپنے رسالۂ "اُردو" اور مطبوعات کے ذریعے سے سب سے پہلے دسویں گیارھویں صدی ہجری کے قدیم ادب کو روشناس کرایا، جس سے ادب اردو کی تاریخ میں انقلاب پیدا ہوگیا۔ انجمن نے قدیم ادب کا بے بہا ذخیرہ فراہم کیا ہے اور یہ کام برابر جاری ہے۔ نیز قدما کا کلام اور اساتذہ کے نایاب تذکرے جو اب تک گمنامی میں تھے، شایع کیے جن کی بدولت اُردو کی تاریخ اور اساتذہ کے حالات کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں رفع ہوگئیں۔ یہ کام اب بھی ہو رہا ہے۔ انگریزی اردو کی کوئی اچھی ڈکشنری نہ تھی۔ جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں (اور انھیں لکھے بہت مدت ہوئی) سب ناقص، نامکمل اور موجودہ ضروریات کے لیے ناکافی ہیں۔ انجمن نے ایک جامع اور مکمل ڈکشنری بصرفِ کثیر کئی سال کی مسلسل محنت کے بعد تیار کرائی جو زیر طبع ہے۔ اس کی اشاعت سے سینکڑوں نئے یا بھولے بسرے لفظ ہماری زبان میں رائج ہو جائیں گے۔ علاوہ اس کے قدیم اردو کی لغات، قدیم کتابوں کے

ایک مدّت کے مطالعہ کے بعد تیار کی جا رہی ہی جو اردو زبان و ادب کے مطالعہ اور تحقیق میں بہت مدد دے گی - ایک ضخیم لُغات پیشہ وروں کی اصطلاحات کے متعلق مرتّب ہو رہی ہی جس میں بڑی محنت اور کھکھیڑ اور بہت سی پریشانیوں کے بعد ایک سو سے زائد پیشوں کے ہزارہا لفظ جمع کیے گئے ہیں - انھیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہی کہ ہماری زبان میں اس کثرت سے اور ایسے اچھے اچھے لفظ موجود ہیں جنھیں افسوس ہم بھولتے جاتے ہیں - انجمن نے کئی سال سے ایک رسالہ سائنس کے نام سے جاری کر رکھا ہی جس کا مقصد یہ ہی کہ اردو میں سائنس کے مضامین اور خیالات ادا کرنے کی کوشش کی جائے اور اردو داں طبقے میں سائنس کا ذوق پیدا کیا جائے۔ اگرچہ انجمن کو اس میں خسارہ ہی لیکن خوشی کی بات ہی کہ لوگوں میں اس کا شوق پیدا ہو چلا ہی - دار المصنفین اعظم گڑھ کی سرگرم جماعت اور جامعہ ملّیہ کے پُر خلوص ارکان بڑی مستعدی سے اردو ادب میں ترجمہ اور تالیف کے ذریعے سے بہت اچھا اضافہ کر رہے ہیں اور ان اداروں سے مختلف علوم و فنون اور ادب کے متعلق قابل قدر کتابیں شایع ہو رہی ہیں - الہ آباد کی ہندستانی اکاڈیمی کی مساعی بھی اس بارے میں لایق شکرگزاری ہیں - وہاں سے متعدد علمی اور ادبی تالیفات اور ترجمے شایع ہو چکے ہیں -

سب سے آخر میں اس ادارے کا ذکر کرتا ہوں جو اپنی اہمیت اور حیثیت کے لحاظ سے سب سے مقدّم ہی یعنی عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کا سررشتۂ تالیف و ترجمہ جو عام طور پر دار الترجمہ کے نام سے مشہور ہی - عثمانیہ یونیورسٹی اور خاص کر اس سررشتے کے قیام سے اُردو زبان کو بڑی تقویت پہنچی ہی بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ اس کی جڑیں مضبوط ہو گئی ہیں -

شاید ہی کوئی فن ہو کہ دارالترجمہ میں اس کی کسی کتاب کا ترجمہ نہ ہوا ہو۔ تاریخ ہند کی چند کتابوں کے علاوہ باقی سب ترجمے ہیں، لیکن اب تالیف کا بھی انتظام ہو رہا ہے۔ غرض تاریخ دستور اساسی، قانون، نفسیات، فلسفہ طبیعات، کیمیا، اعلیٰ ریاضی اور ان کی مختلف شاخوں نیز ڈاکٹری انجینیری وغیرہ وغیرہ پر کئی سو کتابیں شایع اور تیار ہو چکی ہیں گویا اس ادارے نے علم کا دریا بہا دیا ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی میں دبی زبان سے اتنا کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ جو کچھ ہوا ہے بہت خوب ہے لیکن ہمیں اس سے زیادہ کی توقع تھی، کمیت اور کیفیت دونوں میں۔

ایک اور بڑا کام اعلیٰ حضرت حضور نظام خلداللہ ملکہٗ کی منظوری سے نظام گورمنٹ کی سرپرستی میں ہو رہا ہے۔ یہ اردو کی جامع اور محققانہ لغات ہے جو خاص اہتمام سے جدید اصول پر مرتب ہو رہی ہے۔ بخوف طوالت میں طریقۂ کار اور ان اصولوں کو اس وقت تفصیل سے بیان نہیں کرسکتا جو اس کام کے لیے اختیار کیے گئے ہیں، لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس پیمانے پر اس قدر صحت و تحقیق کے ساتھ ہمارے ملک کی کسی زبان کی لغات اب تک نہیں لکھی گئی ہے۔ اس کی منظوری بھی انجمن ترقیٔ اردو ہی کی تحریک پر ہوئی تھی۔ ایک انسائکلو پیڈیا کی ضرورت اور رہ جاتی ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ دیر سویر اس کی بھی کوئی صورت ضرور نکل آئے گی۔

کس قدر خوشی کی بات ہے کہ آج کل جس قدر اخبار اور رسالے جاری ہیں پہلے اس کا عشر عشیر بھی نہ تھا اس میں پنجاب کا نمبر سب سے اوّل ہے۔ ان میں بُرے بھلے سب ہی قسم کے ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کا معیار پہلے کی نسبت بہتر اور بلند ہے۔ بعض اردو رسالوں میں ادبی، علمی،

تنقیدی اور تاریخی مضامین بہت تحقیق اور متانت سے لکھے جاتے ہیں اور کبھی معاملات حاضرہ پر بھی معقول بحث ہوتی ہے۔ اس زمانے میں اخبار اور رسالے علم اور معلومات کی اشاعت کا بڑا ذریعہ ہیں۔ یہ اپنے دوسرے مقاصد کے ساتھ اپنی زبان کی بہت بڑی خدمت کر سکتے ہیں۔ میں کیا کوئی بھی یہ نہیں کہ سکتا کہ ہمارے اخبار ایسے ہی ہیں جیسے ہونے چاہییں یا جیسے دوسرے ممالک یا ہمارے ہی ملک کی دوسری زبانوں میں ہیں۔ لیکن اتنا ضرور کہ سکتا ہوں کہ ان کی حالت روٗ بہ ترقی ہے، ان کی تحریر میں جان ہے اور معلومات اور نظر میں پہلے سے زیادہ وسعت ہے، ظاہری صورت اور چھپائی لکھائی بھی (خاص کر روزانہ اخباروں کی) بہت بہتر ہے۔ لیکن ان صاحبوں کی (اور خاصکر پنجاب کے اڈیٹر صاحبوں کی) خدمت میں دو ایک باتیں مختصر طور پر عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ امید ہے کہ وہ مجھے معاف فرمائیں گے۔ اول یہ کہ بعض نامور روزانہ اخباروں میں مقالہ افتتاحیہ (لیڈنگ آرٹیکل) میں غیر ضروری بلند آہنگی اور طوالت کے ساتھ اس قدر پیچیدہ، مغلق اور ثقیل الفاظ اور جملوں کی بھرمار ہوتی ہے کہ اصل مفہوم اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ الفاظ زیادہ اور معنی کم۔ دوسرے آپس کی توتو میں میں اور ایک دوسرے کی پگڑی اُچھالنی بالکل ترک کر دی جائے۔ یہ ان کی شان کے خلاف ہے۔ تیسرے ملکی معاملات میں ذاتی عناد اور بغض و عداوت کا اظہار یا کسی کی ذات پر عامیانہ اور سوقیانہ حملے بالکل ناجائز ہیں۔ چوتھے اُن کی رائے کچھ ہی ہو مخالف کے بیان کو کبھی مسخ کرنے کی کوشش نہ کی جائے اور جہاں تک ممکن ہو صداقت اور ایمانداری سے ظاہر کیا جائے۔ پانچویں پراپیگنڈے کی رَو میں صداقت اور متانت کو

ہاتھ سے نہ دینا چاہیے۔

ہمیں ایک یا کئی ایسے ہفتہ وار اخباروں کی بھی ضرورت ہے جو روزانہ اخبار کی خبروں کو صحیح معلومات کے ساتھ اس طرح بیان کریں کہ ان میں کسی قسم کا ابہام باقی نہ رہے اور پڑھنے والا کامل طور پر انھیں سمجھ لے۔ معاملات حاضرہ مثلاً مسائل سیاسیات و معاشیات پر نہایت محنت اور غور کے ساتھ ایسے مضامین لکھیں یا ماہرین سے لکھوائیں کہ پڑھنے والا مسئلہ کے ہر پہلو کو پورے طور پر سمجھ جائے اور سمجھنے کے بعد اسے غور و فکر کرنے کا موقع ملے۔ خبروں کو سلیقے کے ساتھ درج کریں اور ان کے متعلق جن ضروری معلومات کی ضرورت ہے انھیں بیان کردیں۔ جتھے بندی سے بالا بالا ہوں۔ مختلف ملتوں یا فریقوں کے لڑانے کی کوشش نہ کریں بلکہ ان کے نقطۂ نظر کو صفائی اور سچائی سے بیان کریں اور اپنی رائے کو کسی پر حملہ کیے بغیر آزادانہ اور بے باکانہ ظاہر کرنے میں دریغ نہ کریں۔ بے لاگ رہیں مگر ناگواری پیدا نہ ہونے دیں۔ کبھی کبھی اپنی زبان اور ادب کے متعلق ملک میں جو کام ہو رہا ہے اس پر بھی بحث کرتے رہیں۔ طرز تحریر میں متانت، سلاست اور شگفتگی ہمیشہ مدنظر رہے۔ ایسے اخبارات سے اُردو داں طبقے کو خبروں کی بہم رسانی کے علاوہ تعلیمی فائدہ بھی پہنچے گا اور ان کے علم اور معلومات میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ ممکن ہے کہ شروع میں ایسے اخبار کی بِکری کم ہو لیکن کچھ مدت کے بعد اسے ضرور فروغ ہوگا۔

یہ بھی کچھ کم مسرت کی بات نہیں ہے کہ ہندستان کی متعدد یونیورسٹیوں میں اُردو کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہوگیا ہے اور ہماری یہ توقع کچھ بے جا نہ ہوگی کہ ان یونیورسٹیوں سے جو نوجوان تعلیم پاکر نکلیں گے وہ یونیورسٹیوں کے

معلّمین کی حیثیت سے یا بحیثیت انشا پرداز اور ادیب کے اپنی زبان کی خدمت بجا طور پر انجام دیں گے۔ اس ضمن میں میں ایک اور بات بیان کرنا چاہتا ہوں جسے بیان کرتے ہوئے مجھے کسی قدر حجاب معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آج کل یورپ کی ڈگریوں کو وہ غیر معمولی عظمت حاصل ہوگئی ہے کہ ہماری زبانوں کی اعلیٰ ڈگریاں بھی وہیں سے حاصل کی جاتی ہیں۔ میں عربی فارسی سنسکرت کے متعلق کچھ نہیں کہتا غالباً ان کا سامان وہاں یہاں سے زیادہ ہوگا لیکن اُردو کی ڈگری وہاں سے حاصل کرنا اور ایسے فضلا سے سند لینا جو خود ہماری زبان و ادب سے بے بہرہ ہیں، مجھے مضحکہ معلوم ہوتا ہے۔ میں ان حضرات کو کیٹلاگی محقّق کہتا ہوں۔ اُن کا علم زیادہ تر ان کیٹلاگوں (فہرستوں) پر مبنی ہوتا ہے جو یورپ کے علما نے مرتّب کردی ہیں۔ وہ سوائے کتاب کے کتاب کے متعلق ہر قسم کا علم رکھتے ہیں۔ وہ یہ بتا سکتے ہیں کہ اس کتاب کا مصنّف کون ہے، کس زمانے میں ہوا ہے، سنہ وفات کیا ہے، اس کے معاصر کون تھے، اس کی تصانیف کون کون سی تھیں، اس کے ماخذ کیا کیا ہیں، اس کے مختلف نسخے کس کس کتب خانے میں ہیں، ان کے سنین کتابت کیا ہیں اور ان نسخوں میں کیا کیا اختلاف ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جب وہی کتابیں کھول کر ان کے سامنے رکھی جاتی ہیں تو ان کے سمجھنے اور بعض اوقات صحیح پڑھنے سے بھی قاصر رہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تحقیق کا ڈھنگ وہیں آتا ہے۔ ہم نے وہ مقالے (تھیسس) بھی دیکھے ہیں جو وہاں سے لکھے ہوئے آئے ہیں، ہمارے بعض مستعد طلبہ، معلّمین اور پروفیسروں نے گھر بیٹھے اُن سے کہیں بہتر اور زیادہ محققانہ مقالے لکھے ہیں۔ اس کا دوش میں ان کو نہیں دیتا جو

یورپ جاکر یہ ڈگریاں لائے ہیں، بلکہ اس میں سراسر قصور ان یونیورسٹیوں کا ہی جو ڈگری دیکھتی ہیں اور کام نہیں دیکھتیں اور غلامانہ ذہنیت کی وجہ سے بلا امتیاز ہر ڈگری کے کاغذ کو سندِ فضیلت خیال کرتی ہیں ۔ اردو کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کا انتظام یہاں کہیں بہتر ہو سکتا ہی اور یہاں اُس کے لیے کہیں زیادہ سامان موجود ہی ۔ کیا مسلم یونیورسٹی یا جامعۂ عثمانیہ اس کا انتظام نہیں کرسکتی ؟ بجائے اس کے کہ ہم وہاں جاکر اپنی زبانوں کی نمائشی سندیں حاصل کریں ہمیں خود یہاں کام کرکے حقیقی سند حاصل کرنی چاہیے اور اس کا انتظام ایسا مکمل اور بہتر ہونا چاہیے کہ اہلِ یورپ بھی اس کا لوہا مان جائیں اور ضرورت ہو تو وہ یہاں آکر ہماری زبانوں کی سند حاصل کریں ۔ یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں جتنا کہ خیال کیا جاتا ہی ۔

حضرات! افسوس ہی کہ مجھے آپ کے سامنے کئی ناگوار باتیں کہنی پڑیں لیکن ایک بات اور کہنے کی اجازت چاہتا ہوں ۔ انھیں چند دنوں میں مجھے بعض ایسی تحریریں پڑھنے کا اتفاق ہؤا جنھیں دیکھ کر ملال ہوتا ہی ۔ پنجاب کے ایک رسالے کے قابل اڈیٹر کو کسی غیر معروف شخص نے یوپی کے کسی مقام سے شاید رسالے کی بعض غلطیوں کی طرف توجہ دلائی تھی ۔ اس پر اڈیٹر صاحب نے نہایت تلخ و ترش لہجے میں غم و غصہ کا اظہار فرمایا ہی اور سارے صوبے اور اس کے اہلِ زبان کی خبر لے ڈالی اور اس پر بس نہیں کی بلکہ دکن کی بعض علمی تحریکوں اور کارناموں کے حال پر بھی نوازش فرمائی ہی ۔ اس کے بعد ہی مجھے ایک لایق تعلیم یافتہ کا لکچر ملا جو انھوں نے جنوبی ہند کی ایک کانفرنس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کے سامنے پڑھا تھا اس کی ابتدا بھی اسی الاپ سے کی ہی ۔ چند ہی روز ہوئے میرے پاس دو کتابیں پہنچیں

جن میں ایک قابل ادیب اور شاعر اور نقّاد نے بے ضرورت اور بلاوجہ اس مضمون کو چھیڑ کر جلی کٹی سنائی ہیں۔ یہ حالت قابل افسوس ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے یوپی کے کسی معقول پسند اور مستند شخص نے کبھی پنجاب یا دکن کے علمی کاموں کی تحقیر نہیں کی بلکہ ایسے تمام صاحبوں نے ہمیشہ ان کے علمی اور ادبی کارناموں کی دل کھول کر داد دی ہے۔ اور اگر تنقید کرتے وقت کسی نے کچھ لکھ دیا یا بعض غلطیاں جتائیں تو اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔ کیا خود ان کے ہم وطن ان کی تنقید کرتے وقت کچھ کمی کرتے ہیں۔ کیا یوپی کے اہل زبان نے اپنے ادیبوں اور شاعروں پر نکتہ چینی نہیں کی؟ کونسا ایسا ادیب اور شاعر ہے جو اس سے بچ رہا ہو۔ جب میرؔ اور سوداؔ اور غالبؔ تک نہیں بچے تو دوسرا کس منہ سے شکایت کرسکتا ہے۔ آزاد مرحوم بار بار مصحفی کے امروہہ پن پر طعن کرتے ہیں۔ یہ کب نہیں ہُوا اور کہاں نہیں ہوا؟ پہلے مشاعروں میں ردّ و ردّ اعتراض ہوتے تھے، اب اخباروں اور رسالوں میں ہوتے ہیں۔ جب مسدّس حالی شایع ہُوا تو کیا کچھ طوفان نہیں برپا ہُوا۔ کئی مسدّس اس کے جواب اور رد میں لکھے گئے۔ اور یہ تو آپ میں سے بعض صاحبوں کو یاد ہوگا کہ مقدمۂ شعر و شاعری کی اشاعت پر کس قدر اعتراضوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ ایک اخبار نے تو مسلسل بیس تیس مضامین لکھے جن میں کتاب اور مصنّف دونوں کا مضحکہ اڑایا تھا۔ مولانا حالی نے نہ کبھی جواب دیا اور نہ بُرا مانا۔ یہ باتیں جواب دینے یا غم و غصہ کے اظہار کی نہیں، اس سے اپنی کمزوری کا اظہار ہوتا ہے۔ اسے صوبہ واری رشک و حسد یا سیاست اور تجارت کی طرح رقابت و مخالفت کا اکھاڑا نہیں بنانا چاہیے۔ اس میں سب کا نقصان ہے۔ ہم سب اپنی زبان کے خادم ہیں۔ ہمیں اتحاد عمل کی ضرورت ہے۔ میں شروع ہی میں عرض کرچکا ہوں

کہ زبان ذات پات، قومیت، وطنیت سے بری ہے۔ جو اسے بولتا ہے اسی کی زبان ہے جو زیادہ صحت اور فصاحت کے ساتھ لکھتا بولتا ہے وہی زیادہ تر زبان دان اور اہل زبان کہلانے کا مستحق ہے۔ اس میں نہ کسی صوبے کی تخصیص ہے اور نہ کسی قوم اور نسل کی۔ انجمن ترقیٔ اردو یہ تجویز کر رہی ہے کہ جو ادارے مختلف مقامات میں اردو زبان کی خدمت انجام دے رہے ہیں ان کے نمایندے اور خاص خاص ایسے لوگ جنھیں زبان سے ہمدردی ہے اور علم و فضل اور تجربہ رکھتے ہیں ایک جگہ جمع ہوں، زبان کے مسائل پر غور کریں، اپنے کاموں کا جائزہ لیں، آیندہ کے لیے پروگرام بنائیں اور ان پیچیدگیوں اور خرابیوں کے رفع کرنے کی کوشش کریں جو اس کی ترقی میں حائل ہیں۔ اس طریق کار سے عمل میں نیز آپس میں اتحاد کی شکل پیدا ہو جائے گی۔ میں حال ہی میں مدراس گیا تھا، وہاں مجھے اردو زبان کے متعلق بعض مقامی حالات ایسے معلوم ہوئے جن کا کبھی علم نہ تھا۔ مجھے اپنی بے خبری پر بہت افسوس ہوا، ممکن ہے کہ اسی طرح ہم میں سے اکثر اسی بے خبری میں مبتلا ہوں۔ یہ بے خبری ہماری زبان کے حق میں بہت مضر ہے۔ اس لیے مجھے خیال ہوا کہ جہاں تک جلد ممکن ہو ہمیں ہر صوبے کی اصل حقیقت سے آگاہ ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس خیال کے آتے ہی میں اس ادھیڑ بُن میں لگ گیا اور ایک فہرست ایسے استفسارات کی مرتّب کی جو تقریبًا تمام حالات پر حاوی ہیں۔ تجویز یہ ہے کہ یہ فہرست ایک مختصر کمیٹی کے سامنے پیش کی جائے اور ان کے مشورے اور منظوری کے بعد ہر صوبے اور علاقے کے بعض ایسے اصحاب کے پاس بھیجی جائے جو اس کام سے ہمدردی اور اپنے صوبے کے حالات سے واقفیت رکھتے ہیں تاکہ وہ غور کرنے کے بعد اس کے جواب تیار کریں۔

اس کے بعد کمیٹی کے چند ارکان یعنے کم سے کم تین شخص ہر صوبے اور علاقے میں جاکر مقامی حالات کا معائنہ کریں اور وہاں کے واقف کار حضرات سے مل کر ان مسائل پر گفتگو کریں۔ غرض اس طرح ہر مقام سے معلومات کا ذخیرہ جمع کریں اور آخر میں ایک مفصل رپوٹ تیار کریں۔ یہ رپوٹ اتحادِ عمل اور آئندہ مختلف مقامات میں کام کرنے کے لیے بنیاد کا کام دے گی۔ ابھی تک نہ ہم اصل حقیقت سے واقف ہیں اور نہ ضرورتوں سے۔ اس رپوٹ کے بعد ہم یہ طے کر سکیں گے کہ ہر صوبے میں کس نہج پر کام کیا جائے۔ یہ ایک بہت ہی سرسری سا خاکہ ہے۔ تفصیل کا یہ وقت نہیں۔ اس میں کئی امور ایسے ہیں جو قابلِ غور ہیں اور جن کے طے کیے بغیر کام شروع کرنا ممکن نہیں؛ مثلاً ایک مسئلہ اخراجات ہی کا ہے جو سب میں دشوار ہے۔ بہرحال ان سب مسائل پر غور کرنے کے بعد اس کام کی ابتدا ہو سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کام کی خاص اہمیت دیکھ کر ہمارے اہلِ علم اور اہلِ ثروت ہمیں ضرور اس میں مدد دیں گے۔

حضرات! ہمیں اس بات پر نہ بھولنا چاہیے کہ اردو ہندستان کی عام زبان ہے، تقریباً ہر صوبے میں بولی یا سمجھی جاتی ہے اور ہر قوم و ملّت کے لوگ اسے بولتے یا سمجھتے ہیں، بلکہ ہندستان سے باہر بھی اپنا تسلط جماتی جاتی ہے اور سواحلِ عرب، مکہ، مدینہ، بغداد و دمشق، افغانستان، افریقہ کے بعض علاقوں وغیرہ میں بھی اس کے بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں۔ جب تک اس میں وسعت کے ساتھ گہرائی نہ ہو، جب تک اس کی بنیادیں مضبوط نہ ہوں اور جب تک یہ علمی زبان نہ بنے اس وقت تک یہ سب فخر بےجا ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس زبان میں وسعت ہے اور اس میں

لوچ اور جذب کرنے کی قوت اور آگے بڑھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ لیکن یہ خوبیاں اُسی وقت کام آسکتی ہیں کہ ہم ان سے کام لیں اور زبان کو مستحکم اور مکمل بنانے پر آمادہ ہوجائیں۔ بعض اہل سائنس کا قول ہے کہ آیندہ انسان جیسا چاہے گا ویسا بن جائے گا۔ میں اس قول کی تصدیق یا تردید نہیں کرسکتا لیکن زبان کے متعلق بہ وثوق کہہ سکتا ہوں کہ جیسا ہم نے چاہا ویسی بنی اور جیسا ہم چاہیں گے ویسی بنے گی۔ اپنی زبان پر فخر کرکر کے دوسروں کو چنوتی (چیلنج) دینا اور اپنی فوقیت جتانا فعل عبث ہے۔ اسے ایسا مکمل اور کامل بناؤ کہ دوسرے خود اس کی طرف جھک جائیں اور اس کی افضلیت مان جائیں۔ یہ ہماری ہمت پر موقوف ہے۔ اور اس کی صورت وہی ہے جو میں نے عرض کی کہ مختلف اداروں کے نمایندے اور اردو کے ایسے بہی خواہ جن کے دل میں اپنی زبان کا درد ہے ایک جا جمع ہوں اور آیندہ دس سال کے کام کا پورا نقشہ بنالیں اور اس پر ثبات و استقلال کے ساتھ عمل کرنے کا تہیّہ کرلیں۔ اب رہی کامیابی سو اس کی نسبت یہ عرض ہے کہ ہمت نہ ہاریے۔ جس نے ہتیار ڈال دیے وہ مغلوب اور غلام ہے۔ جو آخر تک مقابلہ پر تُلا رہا جیت اسی کی ہے، خواہ وہ ہار ہی کیوں نہ جائے۔

کامیابی آسمان سے نہیں اُترتی، یہ سب محنت، صبر، استقلال کی کرامات ہے۔ جانیں کھپانی پڑتی ہیں تب کچھ ہاتھ آتا ہے۔

ہر اک کو نہیں ملتی یاں بھیک زاہد
بہت جانچ لیتے ہیں دیتے ہیں تب کچھ
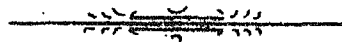
خطبۂ صدارت شعبۂ اُردو ہندستانی اکیڈمی

{یہ خطبہ ہندستانی اکیڈمی الہ آباد کے شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے ۲۱ جنوری ۱۹۳۶ء کو پڑھا گیا}

جنابِ صدر! حضرات!!

اردو زبان و ادب کا جدید دور گزشتہ صدی کے آغاز سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں چار بڑی باقاعدہ اور منظم تحریکیں عمل میں آئیں۔

۱۔ فورٹ ولیم کالج، کلکتہ۔

۲۔ دہلی کالج۔

۳۔ سائینٹفک سوسائیٹی علی گڑھ۔

۴۔ اورینٹل کالج، لاہور۔

پہلی تحریک جو انیسویں صدی کے آغاز میں شروع ہوئی ملکی ضرورت پر مبنی تھی۔ انگلستان سے رایٹر (محرر) بالکل نوعمر آتے تھے، یعنی سولہ سے اٹھارہ برس کی عمر کے۔ ان میں سے اکثر کی تعلیم بہت محدود اور کم ہوتی تھی اور جو کسی کی تعلیم اچھی بھی ہوئی تو اسے مطالعہ اور تعلیمی ترقی کا موقع نہیں ملتا تھا۔ دوسرے جب یہ نوعمر پہلے پہل ہندستان میں آتے تو ان کی حالت لاوارثوں کی سی ہوتی تھی اور ابتدائے ملازمت میں کوئی ان کی اخلاقی اور مذہبی حالت کا نگراں اور رہنما نہیں ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ نااہل اور کاہل ہو جاتے تھے۔

دوسری بڑی بات یہ تھی کہ ملازمین کمپنی کو مختلف السنہ و مذاہب اور اطوار و عادات کے لاکھوں آدمیوں کے عدالتی معاملات فیصلہ کرنے ، اور اضلاع کی مال گزاری کا انتظام کرنا اور ان کے جھگڑے چکانے پڑتے تھے۔ عدالتوں میں وکالت اور تمام ضروری کارروائی دیسی زبان کے ذریعے سے ہوتی تھی۔ قانون انگریزی نہیں بلکہ یہاں کا قدیم قانون رائج تھا۔ اس لیے مجسٹریٹوں کے فرائض بہت پیچیدہ اور اہم ہوگئے تھے۔ معمولی فرائض کے علاوہ ججوں، مجسٹریٹوں کو وقتاً فوقتاً گورنر باجلاس کونسل کے سامنے موجودہ قوانین کے متعلق ترمیمات وغیرہ پیش کرنی ہوتی تھیں جس کے لیے انھیں اہل ملک کی خواہشات اور ضروریات کا جاننا ضروری تھا۔

سب سے بڑی چیز تجارت تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا اصل منشا تھا۔ اس سے پہلے یہاں کوئی فرماں روا تاجر کے بھیس میں نہیں آیا تھا۔ اس لیے کسی کو گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ یہ اجنبی تاجر کوٹھیاں بناتے بناتے قلعے تعمیر کرنے لگیں گے۔ تجارت کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ تاجر ملک کی زبان اور حالات سے واقف ہو۔ اور جہاں تجارت کے ساتھ حکومت کا سایہ بھی ہو تو ملک کی زبان، اہل ملک کے عادات اور رسم و رواج اور ان کے آئین و قوانین کا جاننا لازم ہوجاتا ہے۔

اسی زمانے میں ایک آفت اور پیدا ہوگئی تھی اور اس کا انسداد ضروری تھا۔ انقلاب فرانس نے تمام یورپ میں ہل چل مچادی تھی، مذہبی اور سیاسی خیالات میں ہیجان پیدا ہوگیا تھا اور وہ خطرناک اصول رفتہ رفتہ کمپنی کے فوجی اور ملکی ملازمین تک بھی پہنچ گئے تھے۔ اس لیے بڑا اندیشہ تھا کہ کہیں یہ لوگ اس کا شکار نہ ہوجائیں۔ ایسے موقع پر دل و دماغ کو زیر کرنے کے لیے

دو قوتوں سے کام لیا جاتا ہے۔ایک حکومت، دوسری مذہب۔اس لیے حکومت اور مذہب کے اصول سکھانے ضروری تھے تاکہ نووارد جوان عام روش سے بھٹکنے نہ پائیں۔اسی وجہ سے مذہبی تعلیم کالج کا جزو تھی اور کوئی اعلیٰ عہدہ یا پروفیسری یا لکچراری کی خدمت کسی غیر عیسائی کو نہیں دی جاتی تھی اور ایسے عہدہ دار کو اقرار صالح کرنا پڑتا تھا کہ وہ بخ کے طور پر یا علانیہ ایسے عقائد اور آراکی تعلیم نہ دے گا جو عیسائی مذہب یا چرچ آف انگلینڈ کی تعلیم و ارکان کے خلاف ہو۔

ان خیالات کو پیش نظر رکھ کر لارڈ ویلزلی نے ۴ رمئی سنہ ۱۸۰۰ء کو ایک مدرسہ بنام فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ویلزلی بڑا اولوالعزم شخص تھا اور اس مدرسے کے متعلق اس کے بڑے بڑے خیالات تھے۔وہ اس میں قدیم وجدید السنہ، ہندستان کی دیسی زبانوں، اصول، قانون، تاریخ عامہ و تاریخ ہندستان، نیچرل ہسٹری، کیمیا، معاشیات، ریاضی، نباتیات وغیرہ سب کی تعلیم دینا چاہتا تھا، مگر "پیسے کے لوبھی" کمپنی کے ڈائرکٹروں کے سامنے اس کی کچھ پیش نہ گئی۔اس لیے اس کی تعلیم زیادہ تر دیسی اور مشرقی زبانوں تک محدود رہ گئی۔ڈائرکٹر سرے سے کالج کے مخالف تھے، محض لارڈ ویلزلی کی سینہ زوری سے چند سال تک یہ مدرسہ قایم رہا۔

یہ کچھ بھی سہی لیکن اس میں مطلق شبہ نہیں کہ کالج نے دیسی زبانوں اور خاص کر ہندستانی زبان کے لیے بہت مفید کام کیا۔اردو زبان میں سادہ اور روز مرہ کی زبان لکھنے کا ڈھنگ ڈالا اور مقفّیٰ اور مسجّع عبارت ترک کر دی گئی۔کوئی پچاس سے اوپر کتابیں تیار ہوئیں اور طبع کی گئیں جن میں کچھ ترجمے تھے، کچھ تالیفات اور کچھ انتخابات جو قصص و حکایات، تاریخ و تذکرہ، لغات

و صرف و نحو اور مذہب وغیرہ کے مضامین پر مشتمل تھے۔ کالج نے اردو زبان کے حق میں دو بڑے کام کیے۔ ایک تو روزمرہ کی زبان کو صفائی اور فصاحت کے ساتھ لکھنا سکھایا۔ دوسرے اس زمانے کے لحاظ سے لغت اور صرف و نحو پر جدید طرز پر کتابیں لکھنے کی کوشش کی گئی۔ اس میں ڈاکٹر جان گلگرسٹ کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس کی بعض کتابیں اب بھی پڑھنے کے قابل ہیں اور اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ ایک کام اس نے یہ کیا کہ نستعلیق ٹائپ کا مطبع قائم کیا اور کالج کی کتابیں اسی میں طبع ہونے لگیں۔ یہ مسئلہ اب تک زیر بحث ہے اور اس میں جیسی کہ چاہیے کامیابی نہیں ہوئی۔ اگر یہ کالج قایم رہتا اور حسب ضرورت اس کے مقاصد میں توسیع ہوتی رہتی تو بڑی قابل قدر خدمت انجام دیتا۔

دوسری تحریک دِلّی میں نمودار ہوئی۔ دہلی کالج کا ذکر ہندستان کے نظام تعلیم کے سلسلے میں نیز اردو زبان کی تاریخ میں ہمیشہ کیا جائے گا اور تعریف کے ساتھ کیا جائے گا اگرچہ افسوس ہے کہ ہندستان کی تعلیمی تاریخ کے لکھنے والے اسے اکثر بھول جاتے ہیں۔ اس کی تین بڑی خصوصیتیں تھیں۔ ایک یہ کہ یہ پہلی درسگاہ تھی جہاں مشرق و مغرب کا سنگم قائم ہوا اور ایک ہی چھت کے نیچے ایک ہی جماعت میں مشرق و مغرب کا علم و ادب ساتھ ساتھ پڑھایا جاتا تھا۔ اس ملاپ نے خیالات کے بدلنے، معلومات میں اضافہ کرنے اور ذوق کی اصلاح میں بڑا کام دیا اور ایک نئی تہذیب اور نئے دَور کی بنیاد رکھی اور ایک نئی جماعت ایسی پیدا کردی جس میں سے ایسے پختہ کار، روشن خیال اور بالغ نظر انسان اور مصنف نکلے جن کا احسان ہماری زبان اور سوسائٹی پر ہمیشہ رہے گا۔ دوسری خصوصیت اس کی یہ تھی کہ ذریعۂ تعلیم اردو زبان تھا۔ تمام مغربی علوم اردو ہی کے ذریعے پڑھائے جاتے تھے اور

باوجود ان موانعات کے جو معترضین ذریعۂ تعلیم کی بحث میں ہر موقع پر پیش کرتے تھے وہ نہایت کامیاب رہا۔ کالج کے پرنسپل اپنی ایک رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ "مشرقی شعبے کا طالب علم اپنے مغربی شعبے والے حریف سے سائنس میں کہیں بڑھا ہوا ہو"۔ علاوہ اس کے جن جن ماہران تعلیم اور قابل اصحاب نے کالج کا معائنہ کیا انھوں نے اس کی تصدیق کی۔ ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن احاطۂ بنگال اپنے تبصرۂ تعلیمی بابت سنہ ۱۸۵۳ء میں لکھتے ہیں کہ :-

"ایک مدت سے دلی کالج کی ایک خصوصیت ایسی چلی آرہی ہو جو اسے بالائی اور زیرین صوبجات کے دوسرے کالجوں سے ممتاز کرتی ہو اور وہ یہ ہو کہ وہاں دیسی زبان (اردو) کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہو اور یہ (امتیازی خصوصیت) خاص طور پر ریاضیات کی تمام شاخوں اور کم و بیش تاریخ اور اخلاق و فلسفہ کی تعلیم سے تعلق رکھتی ہو۔ اس طریقۂ تعلیم پر مسٹر بتروس نے اپنے زمانۂ پرنسپلی میں استقلال کے ساتھ عمل درآمد کیا اور ان کے جانشین ڈاکٹر سپرنگر نے اسی جوش کے ساتھ اسے جاری رکھا۔ یہ اب دہلی کالج کے نظام تعلیم کا ایک جزو تسلیم کرلیا گیا ہو۔ مناسب یہ ہو کہ اسے آزادی کے ساتھ بڑھنے اور پھولنے پھلنے دیا جائے۔ چند سال بعد ہمیں اس کے نتائج کا دوسرے طریقے کے نتائج سے مقابلہ کرنے کا موقع ملے گا"۔ افسوس یہ موقع کبھی نہ آیا۔

تیسری خصوصیت یہ تھی کہ اس سے متعلق ایک ٹرانسلیشن سوسائٹی (مجلس ترجمہ) تھی جو کالج کے طلبہ کے لیے انگریزی سے اردو میں درسی کتابوں کے ترجمے کا کام انجام دیتی تھی۔ یہ ترجمے سب کے سب کالج کے اساتذہ اور طلبہ کے لیے ہوئے ہیں۔ اس مجلس کے ترجموں اور تالیف کی تعداد قریب سوا سو کے ہو جو تاریخ، جغرافیہ، اصول قانون، ریاضیات اور اس کی

مختلف شاخوں، کیمسٹری، میکانیات، فلسفہ، طب، جراحی، نباتیات، عضویات معاشیات، وغیرہ علوم و فنون نیز ادبیات پر مشتمل ہیں۔ اس کالج نے صحیح طریقۂ تعلیم کو رواج دینے اور اردو کو علمی زبان بنانے میں عظیم الشان خدمت انجام دی اور اس زمانے کے لحاظ سے اس کا یہ کام نہایت قابل قدر ہے۔ اگر سنہ ۵۷ کی شورش میں اس کا شیرازہ نہ بکھر جاتا اور یہ کالج اسی اصول پر قائم رہتا اور زمانے کی ضروریات کے مطابق اس میں اصلاح و ترقی جاری رہتی تو آج ہماری زبان کہیں سے کہیں پہنچ جاتی۔

اس کے بعد سنہ ۱۸۶۲ء میں سر سید احمد خاں مرحوم نے سائینٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی جس کی غایت یہ تھی کہ علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرا کے مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کا مذاق اہل وطن میں پیدا کیا جائے۔ اس سوسائٹی نے تقریباً چالیس علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں۔ دہلی کالج کے بعد یہ دوسرا ادارہ تھا جس نے اردو زبان میں علوم جدید کو منتقل کرنے اور اسے علمی زبان بنانے کی سعی کی۔ سرسید اسے انگریزی تعلیم پھیلانے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھتے تھے۔ انسٹیٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق بھی اس کے بچّے تھے جنھوں نے ملک میں علمی ذوق اور روشن خیالی پھیلانے میں بڑا کام کیا۔

سنہ ۵۷ کی شورش کے کچھ دنوں بعد جب علمی مرکز دہلی سے لاہور منتقل ہوا تو وہاں اوائل سنہ ۱۸۶۵ء میں ایک انجمن بنام "انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب" قایم ہوئی جو بعد میں "انجمن پنجاب" کے نام سے موسوم اور مشہور ہوئی اور اس کی سعی سے اورینٹل کالج کی بنا پڑی جو بعد میں پنجاب یونیورسٹی کالج کے تفویض کر دیا گیا۔ یہ تعلیمی ادارہ بھی تھا

اور تالیف و ترجمہ کی اکیڈمی بھی۔ مترجم زیادہ تر کالج کے معلّمین اور اس کے رفقا تھے۔ ان صاحبوں نے مختلف علوم و فنون پر بہت سی انگریزی کتابوں کے ترجمے کیے۔ چند کتابیں تالیف بھی کیں اور بعض سنسکرت، عربی، فارسی کتابوں کے بھی ترجمے کیے۔ اس میں ڈاکٹر لائیٹنر کی کوشش اور استقلال کو بہت بڑا دخل تھا۔ وہ انجمن پنجاب کے پریزیڈنٹ اور اورینٹل کالج کے پہلے پرنسپل تھے اور سنہ ۱۸۸۶ء تک اس خدمت پر مامور رہے۔ ان کے جانے کے بعد تالیف اور ترجمے کا کام سُست پڑ گیا۔ اگرچہ پہلا سا زور شور اور اہتمام نہیں رہا تاہم یہ کالج اُردو اور مشرقی زبانوں کی خدمت تعلیم اور امتحانات کے ذریعے سے انجام دے رہا ہے اور گو اب وہاں کوئی شعبہ تالیف و ترجمہ کا نہیں مگر وہ سُنتِ قدیم پروفیسر شفیع، پروفیسر اقبال اور پروفیسر شیرانی کے دم سے زندہ ہے۔

یہ چار تحریکیں جن کا سرسری ذکر میں نے آپ کی خدمت میں کیا ہے، گزشتہ صدی کی ادبی اور علمی ترقی میں بہت بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج اور اورینٹل کالج نے اردو زبان کے لیے جو کام کیا وہ خاص ضرورت سے تھا یعنی درسی کتب کا بہم پہنچانا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس میں بہت سی کتابیں ایسی بھی تھیں جو عام مطالعہ کے لیے بھی مفید تھیں اور ان سے علم و ادب کے شائقین کو بہت فائدہ پہنچا۔ علاوہ معلومات میں اضافہ کرنے اور خیالات میں انقلاب پیدا کرنے کے سنجیدہ مضامین کے لکھنے کا اسلوب بھی رائج ہو گیا۔ سائنٹفک سوسائٹی کا مقصد عام تھا لیکن اس کا کام بھی دہلی کالج ہی کے نہج پر ہوا۔ ان اداروں کے حالات پر غور کرنے سے البتہ ایک بات کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر ادارے نے از سرِ نو

کام شروع کیا اور گزشتہ تحریکوں سے کوئی سلسلہ اور ربط قایم نہ ہو سکا۔ یعنے نہیں دیکھا کہ اس سے پہلے کیا کام ہؤا، کون کون سی کتابیں لکھی اور ترجمہ کی گئیں، کون کون سے نئے الفاظ وضع کیے گئے اور کون سے ایسے پُرانے الفاظ تھے جو نئی اصطلاحات کے لیے استعمال کیے گئے۔ ان کی کونسی چیزیں اختیار کرنے کے قابل ہیں اور کون سی قابل ترک۔ اس سے بڑی بصیرت ہوتی ہے اور کام میں آسانی ہو جاتی ہے۔ جس طرح پچھلوں کے اچھے کام اگلوں کے حق میں مفید ہوتے ہیں اسی طرح ان کی غلطیاں کچھ کم مفید نہیں ہوتیں تاکہ آنے والے ان سے بچیں اور ان کا اعادہ نہ کریں۔

میں دیکھتا ہوں کہ اس زمانے میں جو ادارے زبان و ادب کی ترقی و اشاعت کا کام کر رہے ہیں وہ بھی انھیں غلطیوں میں مبتلا ہیں۔ اور اس سے بھی بڑی غلطی یہ ہو رہی ہے کہ ان کا کام کسی اصول پر نہیں ہو رہا ہے۔ کوئی کتاب اچھی سی ہاتھ لگ گئی اس کا ترجمہ کر لیا۔ کسی نے کوئی چیز لکھ کر بھیجی، کمیٹی نے پسند کی، چھپ گئی۔ کوئی تالیف شایع ہوئی، سفارش کے ساتھ پیش ہوئی، انعام دے دیا۔ کچھ لکچر دلوا دیے، کچھ جلسے کر لیے اور سب سے بڑا کارنامہ یہ کہ مشاعرے کا اہتمام کر دیا۔ گویا ہم اندھیرے میں چاند ماری کر رہے ہیں، لگا تو تیر نہیں تو تُکّا۔ اس طرح سے کام نہیں ہوتے، ان حرکتوں سے زبان اور ادب نہیں بنتا، ان طریقوں سے آپ خیالات میں انقلاب اور طبائع میں جدت نہیں پیدا کر سکتے۔ اس سے بھی بڑی کوتاہی بلکہ معصیت جس کا ارتکاب یہ ادارے کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ان اداروں میں باہمی اتحاد اور ارتباط نہیں ہے۔ ہر ایک نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رکھی ہے۔ جب مقصد ایک ہے، کام ایک ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم کبھی کبھی سر جوڑ کر نہ بیٹھیں

اپنے کاموں پر نظر نہ ڈالیں اور آیندہ کے لیے اپنے کام کا کوئی ایسا نقشہ تیار نہ کریں جو حقیقی طور پر ہمارے ادب کے حق میں مفید ہو - اس اتحادِ عمل ، امدادِ باہمی اور تقسیم کار سے کام میں سہولت اور توسیع اور عمل میں قوّت پیدا ہوگی نیز بہت سے ایسے مسائل حل ہوجائیں گے جو اس وقت ہماری توجہ کے محتاج ہیں - اس طرح سال میں ایک آدھ بار باہم مل بیٹھنے سے اور بہت سی کارآمد باتیں سوجھ جائیں گی جو فرداً فرداً غور کرنے سے خیال میں نہیں آتیں لیکن یہ مجلسیں ہنگامے کی خاطر نہیں بلکہ کام کے لیے ہونی چاہییں اور ان میں صرف انھیں کو دعوت دی جائے جو اہل نظر اور صاحب رائے ہیں - بعد میں اُن کی تجویزیں اور فیصلے اطلاع عام اور تنقید کے لیے شایع کیے جائیں تاکہ ضرورت ہو تو ان فیصلوں پر نظرثانی کی جاسکے -

حاشا وکلّا میرا مقصد کسی ادارے کو الزام دینا نہیں ، ہر ادارہ اپنی بساط اور فکر کے مطابق کچھ نہ کچھ ضرور مفید کام کر رہا ہے - لیکن میرا خیال ہے کہ موجودہ حالت میں جس طرح کام ہو رہا ہے اس میں بہت سا وقت ، محنت اور روپیہ رائیگاں جاتا ہے - اگر ہم متفقہ طور پر کام کی نوعیت ، کام کی تقسیم ، اس کی ترقی و اشاعت اور جدید ضروریات کے متعلق غور کرکے کچھ امور طے کرلیں گے اور ان کے عمل میں لانے کی کچھ تدبیریں بھی سوچ لیں گے اور ان کے انجام دینے کے وقت کا بھی تعیّن کرلیں گے تو یقین ہے کہ ہم اتنے ہی وقت میں اسی قدر محنت اور روپے کے صرف سے بہت بڑا اور بہت بہتر کام کر سکیں گے - میں یہ ذاتی تجربے کی بنا پر عرض کرتا ہوں - انجمن ترقیٔ اُردو ایک مدّت تک اٹکل پچّو کام کرتی رہی - ایک عرصے کے بعد مجھے تجربہ ہؤا کہ اس طرح بے اسلوبی سے کام کرنا کچھ زیادہ مفید نہیں ،

ایک منظّم ادارے کا کام جس کا مقصد زبان و ادب کی ترقی ہو اس سے بہتر و افضل ہونا چاہیے - چنانچہ اب ہم نے ایک خاص اصول پر کام کرنا شروع کیا ہو مثلاً ہم نے اردو شعرا کے تذکرے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مرتب کیے اور اس وقت تک بہت سے کم یاب اور نادر تذکرے شایع ہو چکے ہیں اور بعض ابھی زیر ترتیب ہیں - ان تذکروں سے اردو ادب کا ارتقا اور اس زمانے کی معاشرت کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں اور بہت سی غلط فہمیاں اور غلط بیانیاں جو اب تک چلی آرہی تھیں ان کی بدولت دفع ہو گئیں - چنانچہ ان تذکروں کی اشاعت کے بعد اردو ادب کی تاریخ کے متعلق جو تحریریں اور کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کے مؤلفوں نے ان سے استفادہ کیا ہو - اسی طرح انجمن نے قدیم اردو ادب کے متعلق تحقیق و جستجو کا سلسلہ جاری رکھا ہو اور اردو کی بعض قدیم کتب نظم و نثر شایع کی ہیں جن سے ابتدائے زبان کی کیفیت معلوم ہوتی ہو - نیز انجمن نے ایک سلسلہ لغات کا بھی ترتیب دینا شروع کیا ہو - فی الحال انگریزی اردو کی ایک مبسوط اور جامع لغات زیر طبع ہو اور جلد شایع ہو جائے گی - ہندی اردو لغات بھی زیر ترتیب ہو - پیشہ وروں کی اصطلاحات بھی مکمل ہو چکی ہیں اور اب ان کی نظر ثانی کی جا رہی ہو - اس میں تقریباً بیس ہزار اصطلاحات مختلف پیشوں کی بڑی تلاش اور محنت سے جمع کی گئی ہیں - قدیم اردو کی لغات بھی زیر ترتیب ہو - قدیم الفاظ موجودہ لغت کی کتابوں میں نہیں ملتے - اس سے ادبی تحقیق میں بہت مدد ملے گی - تقریباً ایک سال سے جائزۂ زبان اردو (اردو سروے) کا کام بھی جاری ہو - اکثر صوبوں اور علاقوں سے رپوٹیں وصول ہو چکی ہیں اور باقی مقامات پر کام ہو رہا ہو - اس وقت ایک اور تجویز میرے زیر غور ہو - یہ ارادہ ہو کہ دنیا کی اعلیٰ زبانوں میں جتنی مہا تصانیف

(کلاسکس) ہیں ان سب کا ترجمہ اردو میں کردیا جائے۔ میں نے اس کی ایک فہرست تیار کی ہی جو خاص خاص اصحاب کی خدمت میں رائے کے لیے بھیجی جارہی ہی۔ اگر یہ تجویز عمل میں آگئی تو ہماری زبان میں ایک ایسا عجیب و غریب سامان مہیا ہوجائے گا جو دنیا کا بہترین کارنامہ اور بنی نوع انسان کا افضل ترین ارث سمجھا جاتا ہی اور اس سے ہماری زبان کو جو بیش بہا فائدہ پہنچے گا وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اس کے علاوہ ہم دنیا کی موجودہ بڑی بڑی تحریکوں پر بعض کتابیں تالیف کرا رہے ہیں جو معلومات کی توسیع میں بڑا کام دیں گی۔ اس بیان سے میرا مطلب انجمن ترقیٔ اردو کا اشتہار دینا نہیں بلکہ مثال کے طور پر وہ طریقۂ عمل بتانا ہی جس پر انجمن اس وقت کاربند ہی یا جو اس کے پیش نظر ہی۔

ادبی اداروں کے اتحادِ عمل سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اس وقت جو ہمارے ادب میں بے راہ روی پائی جاتی ہی اس کا بھی انسداد ممکن ہی۔ جب ہم متفقہ طور پر اس کے خلاف آواز بلند کریں گے تو ہماری آواز بے اثر نہیں رہے گی۔ آج کل ہمارے ادب میں خیالی یا اس وقت کے محاورے میں رومانی رنگ غالب ہوتا جاتا ہی۔ کچھ مدت ادبِ جدید کا ایک ایسا دور رہا جس کا تعلق زیادہ تر علی گڑھ تحریک سے تھا، اس وقت کے اہلِ ادب مثلاً سر سید احمد خاں یا مولانا حالی زندگی کے واقعات اور اس کی مشکلات سے بحث کرتے تھے، قومی تنزل کے اسباب، آئندہ ترقی کی تدابیر، تعلیم کی ترغیب، دشواریوں سے مردانہ وار مقابلہ، رسم و رواج اور توہمات کی تنقید، ادب کی اصلاح وغیرہ وغیرہ ایسے مضامین تھے جن پر بحث کرنے سے ان کا قلم نہیں تھکا۔ مولوی نذیر احمد جیسے عالم نے جتنے ناول لکھے وہ سب اس وقت کی زندگی اور معاشرت کا آئینہ ہیں۔ لیکن اس زمانے میں ایسا معلوم ہوتا ہی کہ 'شرر' اور 'آزاد' کی روح نئے

جون میں نمودار ہوئی ہے۔ ہمارے ادیب اور شاعر عالمِ خیال میں پرواز کرتے پھرتے ہیں اور روز بروز حقیقت اور زندگی سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ یوں سمجھیے گویا وہ زندگی کی حقیقتوں اور دشواریوں اور ان پر غور و فکر کرنے سے بچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن کیا وہ ان حیلوں سے بچ سکتے ہیں؟ ادب کی بنا زندگی پر قائم ہے اور اگر یہ نہیں تو وہ ایک بےرسی کہانی ہے۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ ادب زندگی کا ایک آئینہ ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ مثلاً عرب جاہلیت کے شعرا کو لیجیے۔ شاعری ان کی رگ و پے میں پیری ہوئی تھی۔ معمولی سا معمولی اور جزوی سا جزوی معاملہ بھی ان کی نظر میں ایک بڑا واقعہ تھا اور تحریک شعر کے لیے کافی تھا۔ ان کی لڑائیاں، ان کی فتح و شکست، عشق و محبت (خیالی نہیں) خوف و خطر، انتقام، مہمان نوازی وغیرہ یہاں تک کہ ایک بچھیرے کی ولادت تک کا نقشہ ان کی نظموں میں زندہ موجود ہے۔ ان کے کلام میں تازگی، آزادی، مردانہ پن اور ذوق زندگی پایا جاتا ہے۔ اگر ہم ان کے کلام کا مطالعہ کریں تو اس زمانے کی معاشرت، رسم و رواج اور خیالات و توہمات کی تاریخ مرتّب کر سکتے ہیں۔ گزشتہ تیس سال میں ہماری زندگی میں بہت کچھ تغیر واقع ہوا ہے۔ اگر دو ایک شاعروں سے قطع نظر کیا جائے تو کیا ہمارے شعرا کے کلام میں کہیں بھی اس انقلاب کا پتا ہے؟ ہمارے شاعر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ تلامیذالرحمان ہیں۔ مشاہدہ، مطالعہ اور حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں، ان کے دلوں پر آسمان سے ہر وقت الہام کا نزول ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اگر انھیں اپنا اور دوسروں کا وقت ضایع کرنا منظور نہیں تو انھیں اپنی ہوائی پرواز سے اس ناپاک زمین پر اترنا پڑے گا۔ ورنہ ان کی شاعری کو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔

ہمارے رسالے اور اخبار بھی بہت کچھ اسی رنگ میں ڈوبے نظر آتے ہیں۔ وہ دنیا کی ان عظیم الشان تحریکوں پر جنھوں نے دنیا میں ہیجان پیدا کر رکھا ہے بہت کم سنجیدگی سے بحث کرتے ہیں۔ وہ زیادہ تر ادب لطیف، معمولی فسانوں اور نظم نما نثر کے شائق معلوم ہوتے ہیں۔ ایک بڑا عیب یہ ہے کہ جب کبھی وہ ملکی معاملات پر بحث کرتے ہیں اس میں فرقہ بندی کی بساند آنے لگتی ہے یا خواہ مخواہ ایسے معاملات کو جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں مذہبی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ یہ عام طور پر ہندی اردو اخباروں اور رسالوں کی حالت ہے۔ اس سے تنگ نظری اور تعصب پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ ادب کے حق میں زہر ہے۔ اگر ہمارے ادبی ادارے اور کسی غرض سے نہ سہی، صرف ادب کی خاطر یہ تصفیہ کرلیں اور متفقہ طور پر ان باتوں سے اپنی بیزاری ظاہر کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کا اثر نہ ہو لیکن صرف تجویزیں پیش کر دینا اور قرار دادیں منظور کرلینا کافی نہ ہوگا۔ ان اداروں کو خود بھی ان پر عمل کر کے دکھانا ہوگا۔

اس قسم کے اور بہت سے قصے قضیے ہیں مثلاً ہندی اردو یا رسم الخط کی بحث یا اور چھوٹے موٹے مسائل جن کا تعلق زبان اور ادب سے ہے۔ ان جھگڑوں کے سلجھانے کا یہی طریقہ ہو سکتا ہے جو میں نے عرض کیا۔ اپنی اپنی جگہ پر ہر ایک اپنی رائے کو صائب اور قوی سمجھتا ہے۔ لیکن باہم مل بیٹھنے اور مشاورت کی بڑی کرامات یہ ہے کہ جن رایوں کو ہم اٹل سمجھے بیٹھے تھے وہ باہم گفتگو کرنے کے بعد پھسپھسی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ خلوص نیت شرط ہے۔

رسم الخط کا مسئلہ آج کل بہت زیر بحث ہے اور خاصا بھڑوں کا چھتا بن گیا ہے۔ اس میں مشکل یہ آپڑی ہے کہ جیسا ہمارے ہاں عام دستور ہے رسم الخط کو

قومی تہذیب اور مذہب کا جُز سمجھ لیا گیا ہی۔ اس لیے موجودہ حالات میں یہ توقع نہیں ہوسکتی کہ لوگ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں گے۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ ہم اس پر بحث کرنا ترک کردیں۔ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس مسئلے کو جذبات اور مذہب سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ اقتصادی مسئلہ ہی۔ جس رسم خط میں صرف کم ہوگا، وقت کم لگے گا، جگہ کم گھرے گی اور جس کے پڑھنے میں آسانی ہوگی اور جو دیکھنے میں بھی خوشنما ہوگا وہی مقبول ہوکے رہے گا۔ عام طور پر لوگوں نے اسے ہندی اردو سے متعلق کرکے جھگڑے کے لیے ایک نیا شاخسانہ کھڑا کرلیا ہی۔ اس کا حل آسان ہو لیکن اس کا رواج آسان نہیں۔ اس کے لیے ایک مدت درکار ہی۔ فی الحال یہ مناسب معلوم ہوتا ہی کہ اردو رسم الخط میں جو نقائص ہیں ان کی اصلاح کشادہ دلی سے کی جائے۔ ہندی سمیلن نے اس کی طرف قدم اٹھایا ہی۔ اسی طرح اگر کوئی ایسی کمیٹی قرار دی جائے جو اُردو رسم الخط پر غور کرکے اس میں مناسب اصلاح عمل میں لائے تو ایک مفید کام ہوگا۔

ہندستانی اکیڈمی کا وجود اس صوبے میں بہت غنیمت ہی۔ وہ اس قسم کے مسائل حل کرنے اور اسی طرح کی اصلاحیں عمل میں لانے کے لیے قایم کی گئی تھی۔ میں اس وقت اس کے کاموں پر کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن اکیڈمی کے کارفرماؤں کی خدمت میں اس قدر عرض کرنے کی جُرأت کرتا ہوں کہ جب اکیڈمی نے ہندستانی کا لقب اختیار کیا ہو اور ہندستانی کے رواج کا بیڑا اُٹھایا ہی تو کیوں اب تک ایسی کتابیں تالیف نہیں کرائی گئیں اور کوئی رسالہ ایسا شائع نہیں کیا گیا جو ہندستانی زبان میں ہو اور بجنسہٖ بغیر کسی تغیر وتبدل کے دونوں رسم الخط میں لکھا جاسکے۔ اگر یہ ممکن ہو اور اکیڈمی اس کی کوشش

کرے تو زبان کی بڑی خدمت ہوگی - اور یہ جو اعتراض ہے کہ ہندستانی کی دوڑ صرف معمولی بول چال اور کاروبار تک ہے اور ادب میں اس کو کوئی حیثیت حاصل نہیں، بہت کچھ رفع ہوجائے گا - اور اس سے بھی زیادہ مفید کام جو اکیڈمی کرسکتی ہے وہ یہ ہے کہ اسی زبان میں ریڈریں تیار کرائے جو دونوں رسم الخط میں لکھی جائیں۔ اس سے وہ دورنگی جو اس وقت اس صوبے کے مدارس میں پائی جاتی ہے خود بخود اٹھ جائے گی اور لڑکے ابتدا سے ایسی زبان لکھنے اور بولنے کے عادی ہوجائیں گے جو اس علاقے کا ہر شخص سمجھ سکتا ہے - ہندستانی کے رواج کا سب سے بڑا ذریعہ یہ مدارس ہوسکتے ہیں -

حضرات! وقت گزرتا جاتا ہے اور بہت سے ایسے مسائل ادھورے پڑے ہیں - اگر ہم فوراً اور بہت جلد ان کو طے نہیں کرسکتے تو کم سے کم ہمیں ان کے جلد طے کرنے کا سامان فوراً مہیا کرنا چاہیے - جس وقت کوئی ایسی تجویز پیش ہو اور انشاء اللہ اس کا موقع بہت جلد آنے والا ہے تو مجھے امید ہے کہ وہ اصحاب جو اپنی زبان کے سچے بہی خواہ ہیں اپنے تجربے اور مشورے سے مدد دینے میں دریغ نہ فرمائیں گے -
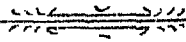
اُردو کا حال اور مُستقبل

{یہ خطبۂ صدارت انجمن حمایت اسلام لاہور کے اکیاونویں سالانہ اجلاس میں بحیثیت صدر شعبۂ اُردو ۱۲ر اپریل ۱۹۳۶ء کو پڑھ کر سنایا گیا}

ای صاحبو!

میں نے لڑکپن میں انجمن حمایت اسلام کا بچپن دیکھا تھا اور اب بڑھاپے میں اُس کی جوانی کی بہار دیکھ رہا ہوں۔ میں جوں جوں بڑھتا جاتا ہوں، بُڈھا ہوتا جاتا ہوں! یہ جوں جوں بڑھتی جاتی ہی جوان ہوتی جاتی ہی۔ اور اے اہلِ پنجاب! جب تک آپ کی ہمّت جوان ہی اس کی جوانی کبھی ڈھلنے نہ پائے گی۔ اس کی ابتدا کا خیال کیجیے تو ایک نازک پودے سے زیادہ نہ تھی جس کی فنا کے لیے ہوا کا ایک جھونکا کافی تھا مگر آج یہ ہری بھری لہلہاتی کھیتی نظر آتی ہی۔ یہ آپ کے استقلال اور ایثار کی بے نظیر مثال ہی۔ یہ انجمن آپ کی سر زمین پر ابرِ رحمت کی طرح چھائی ہوئی ہی۔ اس کے اِدارے بڑھتے جاتے ہیں، اس کے کارخانے ترقی پر ہیں، اس کے مقاصد میں وسعت پیدا ہوتی جاتی ہی اور اس کا اثر اور اس کی وقعت مسلّم ہی۔ اس کی جواں ہمتی کا یہ تازہ ثبوت ہی کہ اس نے عین وقت پر اپنی زبان کی بقا اور فروغ کی طرف توجہ کی ہی جس پر میں آپ کو دل سے مبارک باد دیتا ہوں۔ لیکن یہ پہلی بار نہیں ہی جو پنجاب نے اُردو کی دستگیری کی۔ وہ ابتدا سے اس کی حمایت کے لیے کمربستہ رہا ہی۔ اُردو کی اشاعت اور ترقی میں پنجاب برابر کا شریک رہا ہی اور اب تو شریک غالب ہی۔

اور یہ حقیقت ہو کہ پنجاب نے اسے اپنی زبان بنالیا ہو بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ اسے "اپنی زبان" سے بھی زیادہ عزیز سمجھتا اور عزیز رکھتا ہو۔ اس لیے انجمن حمایت اسلام کا اس سال اپنے سالانہ جلسے میں اُردو کا اجلاس رکھنا سُنّتِ قدیم کی پابندی اور موقع شناسی کی دلیل ہو۔

حضرات! زبان صرف اظہار خیال کا آلہ نہیں بلکہ ہماری زندگی کا جز ہو۔ ہر شخص جو اسے بولتا یا کام میں لاتا ہو وہ اپنی بساط کے موافق اس میں اپنی زندگی کا کچھ نہ کچھ نشان ضرور چھوڑتا جاتا ہو۔ اس میں ہمارے تمدن و شایستگی، خیالات وجذبات، تجربات اور مشاہدات کی تاریخ پنہاں ہو۔ ہر لفظ ایک زندہ شے ہو جو اپنے منہ سے اپنی حکایت بیان کر رہا ہو۔ ہمارے اسلاف نے کیسی کیسی محنت و مشقت سے اسے پالا پوسا ہو اور اپنے خون سے سینچا ہو۔ یہ ایک مقدّس میراث ہو جو نسلاً بعد نسلٍ ہم تک پہنچی ہو۔ ہم ناخلف ہوں گے اگر ہم نے اسے قائم نہ رکھا اور اس کی ترقی و فروغ میں پوری کوشش نہ کی۔

اس وقت اُردو زبان کی ترقی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ملک میں عام طور سے زبان کی اشاعت کے ذرائع اختیار کیے جائیں مثلاً اردو مدارس اور کتب خانوں کا قیام، سرکاری اور غیر سرکاری مدارس میں اُردو کی شرکت، موجودہ نصابِ اُردو کی اصلاح، اُردو کی انجمنوں کا قائم کرنا اور ایسے اُردو اخباروں اور رسالوں کا اجرا، جو سلیس زبان میں زمانۂ حال کے حالات اور واقعات کو اس طرح سنجیدگی اور صفائی سے پیش کریں کہ ہر پڑھا لکھا شخص سمجھ سکے اور مستفید ہو سکے۔ وہ اپنی رائے میں بے لاگ ہوں اور انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ ان جرائد کا تعلق زندگی کے ہر شعبے سے ہو لیکن مخصوص طور پر وہ اپنی زبان کے نگراں ہوں یعنی وہ اپنی زبان کے متعلق ہر قسم کی

خبریں مہیا کریں، مختلف علاقوں میں زبان کی جو حالت ہے اس سے آگاہ کریں اور ان مقامات میں جن اصلاحوں اور کوششوں کی ضرورت ہے اُن پر بحث کریں، اُردو تالیفات کا جائزہ لیں، انصاف کے ساتھ تنقید و تبصرہ کر کے ان کے حُسن و قبح کو ظاہر کریں۔ ان تمام تجویزوں سے بڑھ کر ایک ضرورت اس بات کی ہے کہ اُن مؤلفین و مترجمین کی قدر افزائی کی جائے جو اپنی زبان میں قابلِ قدر کام کر رہے ہیں۔

دُوسری صورت زبان کی ترقی کی یہ ہے کہ زبان کو مستحکم اور شایستہ بنایا جائے۔ استحکام سے میری مراد یہ ہے کہ مختلف قسم کی جامع لغات، مبسوط صرف و نحو، انسائیکلو پیڈیا کی تالیف اور ہر قسم کے علوم و فنون پر تالیفات مہیّا کی جائیں۔ زبان کو شایستہ بنانے کے معنی یہ ہیں کہ زبان میں صفائی، شستگی اور پختگی پیدا ہو، وہ نازک سے نازک خیال ادا کرنے پر قادر ہو اور اس میں مختلف اسالیب بیان کے سانچے موجود ہوں۔ یہ اُسی وقت ممکن ہے جب کہ زبان میں اعلیٰ درجے کی تصانیف و تالیفات اور غیر زبانوں کی بہترین تصانیف کے ترجموں کا ذخیرہ فراہم ہو جو اہلِ قلم کی رہنمائی کر سکے۔

پہلی شق یعنی اشاعت زبان کے متعلق انجمن ترقیٔ اُردو نے ڈول ڈالا ہے۔ سب سے اوّل یہ تجویز ہے کہ ہندستان کے تمام علاقوں اور صوبوں میں اُردو زبان کا جائزہ لیا جائے جس کا یہ مطلب ہے کہ جہاں تک ممکن ہو تحقیقی طور سے یہ معلوم کیا جائے کہ اُن علاقوں میں اُردو سمجھنے، بولنے والوں اور پڑھے لکھوں کی کیا تعداد ہے، کتنے سرکاری اور امدادی مدارس ہیں جن میں اُردو کی تعلیم دی جاتی ہے، یہ تعلیم کس درجہ تک ہے اور طلبہ کی کیا تعداد ہے، اس کے درسی نصاب کی کیا حالت ہے، قدیم طرزِ مدارس کی تعداد جن میں اُردو پڑھائی جاتی یا

ذریعۂ تعلیم ہے کتنے ہیں اور ان میں طلبہ کی تعداد کیا ہے، سرکاری اور نجی اُردو کتب خانوں کی تعداد ایسی انجمنوں اور اداروں کی تعداد جو اُردو کی خدمت کرتے ہیں، اردو مطابع اور جرائد کی تعداد اور حالت، سرکاری محکموں اور عدالتوں میں اُردو کی حیثیت۔ اِن شمار و اعداد کے علاوہ یہ بھی دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہاں اُردو زبان ترقی پر ہے یا انحطاط پر اور اس کے کیا اسباب ہیں، لوگوں کو اُردو سیکھنے اور پڑھنے کا شوق ہے یا نہیں، وہاں کی زبان کی مقامی خصوصیات، اُردو کا اثر قرب وجوار کی زبانوں پر، وہاں کی قدیم تصانیف اور مصنفین اور شعرا کے نام وغیرہ وغیرہ۔ نیز اس بات کے کھوج لگانے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ ہر علاقے میں اس کے حالات کی رُو سے اُردو کی اشاعت و ترقی کے لیے کیا تدابیر عمل میں لائی جائیں۔ یہ تجویز جب میں نے شروع میں ایک منتخب کمیٹی کے سامنے پیش کی تھی تو اس کی مشکلات دیکھ کر ارکانِ مجلس کو اس کی کامیابی کے متعلق بہت کچھ شُبہ تھا اور بعض دوستوں نے مجھے لکھا بھی کہ تم کس خبط میں گرفتار ہو، یہ بیل منڈھے چڑھنے والی نہیں ہے۔ لیکن میں کسی قدر خوشی سے یہ اطلاع دیتا ہوں کہ بعض صوبوں اور علاقوں سے مکمل رپوٹیں وصول ہوگئی ہیں اور بعض میں کام جاری ہے۔ ہر علاقے سے رپوٹیں وصول ہونے پر ایک مکمل رپوٹ شائع کی جائے گی۔ یہ گویا تمام ہندستان میں اُردو زبان کی موجودہ حالت کا آئینہ ہوگا۔ یہ ایک نہایت ضروری اور بُنیادی کام ہوگا۔ اس پر ہم اپنی عمارت کھڑی کرسکیں گے۔ تمام حالات معلوم ہونے پر ہم ہر صوبے اور علاقے میں اُردو کی اشاعت و ترقی کا کام شروع کریں گے اور مجھے یقین ہے کہ آپ کا صوبہ اس معاملے میں سب سے پیش پیش ہوگا۔

دوسری شق زبان کے مستحکم اور شایستہ بنانے کی ہے۔ انجمن ترقیٔ اُردو

اُس کی طرف سے بھی غافل نہیں رہی - چنانچہ اس نے قدیم کمیاب تذکرے اور قدیم اُردو کی کتابیں جن پر اُردو ادب کی تاریخ کا بہت کچھ انحصار ہی ڈھونڈ کر طبع کرائیں اور ان کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیاں جو اب تک ہمارے ادب کی تاریخوں میں چلی آرہی تھیں رفع ہوگئیں اور اس وقت سے اردو ادب کی تاریخ کا رنگ ہی بدل گیا۔

اس کے علاوہ مختلف قسم کی لغات زیرِ ترتیب و زیرِ طبع ہیں - مثلاً انگریزی اُردو کی جامع لغات جو زیرِ طبع ہی اور چند ماہ میں چھپ کر شائع ہو جائے گی، اصطلاحاتِ پیشہ وراں جو تقریبًا مکمّل اور زیرِ نظرِ ثانی ہی، اس کا پہلا حصّہ عنقریب مطبع میں پہنچ جائے گا - قدیم اُردو کی لُغات وغیرہ، اُردو زبان کی مبسُوط جامع لغات جو نظام گورنمنٹ کی سرپرستی میں مرتّب ہو رہی ہی وہ بھی انجمن ہی کی تحریک کا نتیجہ ہی - ایک دوسری تجویز جو اس وقت انجمن کے زیرِ غور ہی وہ یہ ہی کہ دنیا کی اعلیٰ زبانوں کی جس قدر بہترین تصانیف ہیں ان کا اُردو میں ترجمہ کر دیا جائے - اس کی فہرست تیار ہوچکی ہی اور اب اسے عمل میں لانے کی تدبیر کی جارہی ہی - یہ کام اگر سرانجام پاگیا تو عظیم الشان کامیابی ہوگی -

اس مختصر ذکر سے میرا مقصد اس بات کا جتانا ہی کہ ادبی اداروں کو وہ اہم کام کرنے چاہییں جو افراد کے بس کے نہیں - اگر ادبی ادارے بغیر کسی اُصوُل کو مدِّ نظر رکھے ایسے ہی کام کرتے رہے جو قابل تعلیم یافتہ لوگ فردًا فردًا کرسکتے ہیں تو ایسے ادارے کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتے، بلکہ بعض حالات میں مُضر ہوں گے کیونکہ اس میں محنت، وقت، روپیہ زیادہ صرف ہوتا ہی اور کام اس کے مقابلے میں ویسا نہیں ہوتا جس کی توقع کی جاتی ہی - ایک مدت کے تجربہ کے بعد اور کچھ کھو کر یہ اتنی سی بات معلوم ہوئی ہی لیکن اسے حقیر خیال نہ کیجیے

یہ بہت بڑی بات ہے اور اس لیے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ صاف صاف اس کا اظہار کر دوں۔ اس کے متعلق ایک دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہمیں اپنی زبان کی حفاظت اور ترقی منظور ہے تو اب ادبی اداروں کو متحد ہو کر کام کرنا چاہیے۔ اتحاد عمل میں بڑی برکت اور قوّت ہوتی ہے۔ جو کام فرداً فرداً مشکل اور محال معلوم ہوتا ہے وہ باہمی مشورے اور اتحاد سے آسان ہو جاتا ہے۔ ہمیں مل کر پہلے سے اپنے "اعمال نامے" تیار کر لینے چاہییں کہ کیا کیا کرنا ہے، کیونکر کرنا ہے اور کتنی مدت میں کرنا ہے۔ یہ موقع اس کی تفصیل کا نہیں۔ اسے میں نے دوسرے وقت کے لیے اُٹھا رکھا ہے۔

حضرات! اُردو زبان میں ایسے ادیب، شاعر اور انشا پرداز گزر چکے ہیں اور بعض اب بھی ہیں جن پر ہم بجا طور سے فخر کر سکتے ہیں لیکن جب ہم دوسری مہذب اور ادبی زبانوں سے مقابلہ کرتے ہیں تو اپنی زبان کی کم مائیگی پر افسوس ہوتا ہے۔ اس کمی کی تلافی ہمارا فرض ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کام کرنے والے کام کر رہے ہیں، ادبی اور علمی ادارے اپنی بساط کے موافق ہمارے ادب و علم کے ذخیرے میں اضافہ کر رہے ہیں، اخبار اور رسالے بھی پہلے سے بہت بڑی تعداد میں شایع ہوتے ہیں، شعر و شاعری کا بھی خوب چرچا ہے بلکہ بعض اوقات وبالِ جان ہوتا ہے لیکن ایک بات جو مجھے کھٹکتی ہے اُسے کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سر سیّد احمد خاں کے زمانے میں (جو جدید ادب کے بانی نہیں تو فروغ دینے والے ضرور تھے) ہمارا ادب عروج پر تھا۔ اس وقت ایسے ایسے ادیب پیدا ہوئے جن کا نام ہمارے ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وہ زندگی کے صحیح معنی سمجھتے تھے اور دوسروں کو سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ ہم بے خبری اور غفلت کے عالم میں تھے، انھوں نے ہمیں جھنجوڑا، چونکایا، خبردار کیا اور رستے پر لگایا۔ وہ ادبی مجاہد تھے۔ وہ سر بکف میدانِ عمل میں اُترے اور زندگی کی مشکلات سے مردانہ وار

ٹکراتے اور مقابلہ کرتے رہے اور اکثر پر غالب آئے ۔انھوں نے اپنے زورِ بیان اور قوّتِ تحریر سے ہل چل مچادی اور سب کو ایک مرکز پر لے آئے ۔ ان میں خلوص ، بے غرضی ، درد اور ایثار تھا۔ انھوں نے اپنے درد سے دوسروں میں سوز، اپنے خلوص اور بے غرضی سے دلوں میں جلا اور اپنے ایثار سے حبِّ قوم پیدا کی اور ایک جماعت ایسی کھڑی کردی جو اپنی قوم کے لیے کام کرنا شرافت اور انسانیت ہی نہیں بلکہ باعثِ نجات سمجھتی تھی۔کیا اب بھی ہمارے ادب کی یہی حالت ہے؟ یہ دیکھ کر کس قدر افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ادیب اور شاعر اس راستے سے ہٹتے جاتے ہیں ۔ وہ زندگی کی کشمکش سے جھینپتے اور مشکلات سے کنیاتے ہیں ۔اس لیے وہ عالمِ خیال کی سیر کرتے رہتے ہیں اور دل فریب خوابوں سے اپنا جی بہلاتے ہیں ۔ ہمیں جہاد کی ضرورت ہے اور وہ سیر و تفریح کے سامان فراہم کر رہے ہیں ۔شعر و ادب صرف "حظِ نفس" کے لیے ہی نہیں ہے اس سے اور بھی بڑے بڑے کام نکل سکتے ہیں تاکہ یہ حظِ نفس کے ساتھ قوتِ رُوح بھی ہو جائے ۔ ہمیں شعر و ادب کی ان تعریفات سے فی الحال قطع نظر کر لینا چاہیے جو فارغ البال اور عیش پرست قوموں نے کی ہیں ۔اس زمانے میں جب کہ ہم طرح طرح کی کشاکشوں میں گرفتار ہیں ، اِن سے آلاتِ حرب کا کام لینا چاہیے ۔آلاتِ حرب سے خدانخواستہ میری یہ مُراد نہیں کہ ہم ملک میں فتنہ و فساد پیدا کریں ۔ نہیں، بلکہ ان سے زندگی کی جنگ میں کام لینا چاہیے ۔ اِن کے ذریعہ سے دلوں کے اُبھارنے ، زندگی کے سنوارنے ، شکوک کے مٹانے اور توہّمات کی بیخ کنی میں مدد لیجیے۔ سید احمد خانی درد اور ایثار دکھائیے کہ بغیر اس کے کسی خیال میں گرمی اور اثر پیدا نہیں ہو سکتا ۔ جس دل میں آگ نہیں وہ دوسروں میں چنگاریاں

کیونکر پیدا کرسکتا ہی۔ جس دل میں لگن نہیں وہ دوسروں کو کیسے اُبھار سکتا ہی۔ یہ لگن کہاں سے اور کیونکر آئے؟ یہ اُس وقت پیدا ہوگی جب آپ میدان میں آئیں گے، لوگوں کی بھیڑ میں گھُسیں گے، کھوے سے کھوا چھلے گا، ہرطرف سے ٹکریں لگیں گی، مشکلات کا سامنا ہوگا۔ اُس وقت آنکھیں کھلیں گی، زندگی اصلی رُوپ میں نظر آئے گی اس وقت آپ کے دل پر چوٹ لگے گی اور درد اور خلوص پیدا ہوگا۔ اس وقت آپ کی صریرِ قلم ہولناک توپوں کی آواز سے زیادہ کارگر اور آپ کی زبان کا ایک ایک لفظ شمشیر کے گھاؤ سے زیادہ کاری ہوگا۔

یہ سچ ہی کہ یہ زمانہ بہت نازک ہی۔ بیکاری روز بروز بڑھتی جاتی ہی۔ معاشیاتی پیچیدگیوں نے ملک کو خستہ کر رکھا ہی جس سے ادیب اور شاعر دونوں چوکڑی بھول گئے ہیں۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہ زمانہ امتحان کا ہی، یہیں ادیب اور شاعر کے جوہر کھُلتے ہیں اور یہی وقت اسے اپنے خداداد جوہر سے کام لینے کا ہی۔ جو ادیب اور صنّاع الگ تھلگ رہنا چاہتا ہی اور کارزارِ زندگی میں شریک نہیں ہونا چاہتا اور خلوص کے ساتھ اپنے فطری جوہر کو کام میں نہیں لانا چاہتا وہ مُجرم ہی اور اُس کی سزا وہی ہی جو ایک غدّار کی ہوتی ہی۔ زبان اپنی نوع انسان کی عملی اور روحانی زندگی کے لیے نہایت درجہ ضروری ہی اس لیے زبان و ادب کی ترقی (جہاں تک ممکن ہوسکے) اُسے قوم کی ضروریات اور حالات کے مطابق بنانے میں ہی۔ یہ نکتہ ہمارے ادیبوں کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے۔

حضرات! زبان بلاشبہ ایک معاشرتی ضرورت اس کی تخلیق کا باعث ہوئی اور وہ اس کی زندگی کا ایسا جزو ہی جو اس سے کبھی جُدا نہیں ہوسکتا۔ وہ انسان سے الگ کوئی شے نہیں ہی۔ وہ ان لوگوں سے وابستہ ہی جو اسے بولتے

اور اس میں فکر کرتے ہیں - اس کی جڑیں ہمارے دل و دماغ اور جسم میں پھیلی ہوئی ہیں اور وہیں سے اس کی نشو و نما ہوتی ہے - زبان کی ترقی و انحطاط معاشرتی حالات کے تابع ہے - یہی وجہ ہے کہ علمائے لسانیات تمدن و معاشرت کی تاریخ کو زبان کی تاریخ میں تلاش کرتے ہیں - اِسے وقتی سیاسیات کا رنگ دینا سوتے ہوئے فتنے کو جگانا ہے - کیا سیاسی کانگرسوں اور سبھاؤں کے لیے یہ مناسب نہ ہوگا کہ وہ اس وقت تک تہذیبی اور ذوقی معاملات پر ہاتھ نہ ڈالیں جب تک وہ قومیت کی کوئی صورت قایم نہ کرلیں ؟ اس سے زیادہ قابلِ الزام وہ سیاسی حضرات ہیں جو زبان کے پردے میں جس کی تہ زمین سیاست ہے اس مسئلہ کو چھیڑ کر طرح طرح سے پروپیگنڈا کر رہے ہیں - انڈین نیشنل کانگریس نے یہ قرارداد منظور کی تھی کہ ہندستان کی زبان ہندستانی ہوگی خواہ وہ ناگری حروف میں ہو یا فارسی حروف میں - یہ فیصلہ معقول تھا اور اُس دوراندیشی پر مبنی تھا جو اِس قسم کی کانگریس ایسے موقعوں پر عمل میں لاتی ہیں لیکن اُن صاحبوں کے اطمینان کے لیے کافی نہ تھا جن کا منشا کچھ اور تھا - انھوں نے اس رزولیوشن کو طفل تسلّی سے زیادہ وقعت نہ دی اور دوسری ادھیڑبُن میں لگ گئے - ان کی کوششوں کا نتیجہ اپریل ۱۹۳۵ء میں ظہور میں آیا - یعنی ہندی سمیلن کا سالانہ جلسہ اندور میں منعقد ہوا جس کی صدارت مہاتما گاندھی نے فرمائی - اس جلسے میں بالاتفاق یہ قرارداد منظور ہوئی:-

"ہندستان کے اُن ادیبوں میں جو اپنے اپنے صوبوں کی زبان میں کام کر رہے ہیں، ارتباط پیدا کرنے کی غرض سے نیز ہندی زبان کے ارتقا میں ان کا اتحادِ عمل حاصل کرنے کی غرض سے یہ کانفرنس اصحابِ ذیل کی ایک کمیٹی قائم کرتی ہے....."

چنانچہ اس کمیٹی نے فوراً کام شروع کردیا اور ماہانہ ہندی رسالہ "ہنس"

جو ہندی اُردو کے مشہور ادیب منشی پریم چند کئی سال سے نکال رہے تھے اس ادارے کے تحت میں آگیا۔ یہ ادارہ "بھارت ساہتیا پرشد" کے نام سے مشہور ہی (یعنی انجمنِ ادبِ ہند) اور ہنس اب اس کا رسالہ ہی۔ منشی پریم چند کے ساتھ گجراتی زبان کے مؤرخ اور ادیب مسٹر کنھیا لال منشی بھی اس کی اڈیٹری میں شریک ہوگئے۔ مہاتما گاندھی اس تحریک کے دینی باپ اور مسٹر کنھیا لال اس کے روح وروان ہیں۔ چنانچہ "ہنس" کے فاضل اڈیٹر اکتوبر کے رسالے میں فرماتے ہیں (یہ میں اپنی زبان میں بیان کرتا ہوں اگر اصل زبان سناؤں تو آپ کے سمجھانے کے لیے مترجم کی ضرورت ہوگی)۔

"اب ہندی مُلکی زبان کی صُورت اختیار کرکے خاص وعام کی زبان ہوچکی ہی۔ مہاتما گاندھی جیسے ملک کے سدھارنے والے اسے **زندہ مُلکی زبان** بنانے کا عہد کرچکے ہیں"

خود مہاتما جی کا خط ملاحظہ فرمائیے جو انھوں نے "ہنس" کے متعلق تحریر فرمایا ہی:-

"ہنس ہندستان بھر میں انوکھا پریتن ہی۔ یدی ہندی اتھوا ہندستانی کو راشٹر بھاشا بنانا ہی تو ایسے ماسک کی آوشکتا ہی۔ پرتیک پرانت کی بھاشا میں جو لیکھ لکھا جاتا ہی اس کا پرچیے راشٹر بھاشا دوارا سب کو ملنا چاہیے۔ بہت خوشی کی بات ہی کہ اب ایسا پرچیے دل چاہے اُن کو ہنس دوارا پرت ماس آدھے روپے میں ادا کرے گا"

اس ہوشیاری کو آپ نے دیکھا۔ اب تک ملک کی زبان "ہندستانی" تھی اور سب سے بڑی اور سب سے زیادہ منظم اور باوقعت کانگریس نے اُسے علی الاعلان تسلیم کرلیا تھا، لیکن اب ہندی یا ہندستانی ہوگئی۔ یا ہندستانی

کے الفاظ خاص ذہنیت کو ظاہر کر رہے ہیں - رفتہ رفتہ یہ لفظ حذف ہوجائیں گے بلکہ یہ سمجھیے کہ ہو گئے جیسا کہ "ہنس" کے اڈیٹروں کی تحریر سے صاف ظاہر ہے - اب اس تحریر کا (جسے مہاتماجی ہندستانی کہتے ہیں) مہاتماجی کے اس خط سے مقابلہ کیجیے جو انھوں نے حکیم اجمل خاں کو اُردو زبان اور اردو رسم خط میں لکھا تھا اور جس کا عکس بعض رسالوں میں شائع ہوچکا ہے - ان دونوں میں سے ہم کس زبان کو ہندستانی کہیں - زبان کو سیاسیات کے خارزار میں گھسیٹنے اور سیاست دانوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنانے کا یہ نتیجہ ہے کہ دو طبقوں میں بجائے اتفاق کے نفاق اور بڑھتا جاتا ہے -

اب مہاتماجی جس زبان کو ہندی یا ہندستانی کہتے ہیں اس کا ایک نمونہ تو آپ نے خود ان کے خط میں دیکھ لیا، دوسرا نمونہ "ہنس" کے فاضل اڈیٹر منشی پریم چند کی تحریر سے پیش کیا جاتا ہے :-

"آپ نے بہت ٹھیک کہا کہ کِوِتا کیول منورنجن کی وستو نہیں اور نہ گا گا کر سنانے کی چیز ہے - وہ تو ہمارے ہردے میں پریرناؤں کو ڈالنے والی، ہمارے ادساد گرست من میں آنندمے اسپھورتی کا سنچار کرنے والی ہم میں کومل بھاؤناؤں کو جگانے والی (استرین بھاؤناؤں کی نہیں) وستو ہے۔"

اسے مہاتما گاندھی ہی ہندستانی کہہ سکتے ہیں ورنہ کسی اور زبان داں کو یہ جرأت نہیں ہوسکتی - یہ میں نے آسان سا جملہ آپ کو سُنایا ہے اگر میں اس رسالے کے کسی مضمون کا کوئی حصہ سناتا تو آپ کانوں میں انگلیاں دے لیتے اور کہہ اُٹھتے :-

گر تو ہندی بدیں نمط خوانی　　ببری رونقِ زبان دانی

اور یہ بھی یاد رہے کہ جو جملے میں نے ابھی آپ کو سنائے ہیں یہ ایسے شخص کی تحریر ہے جو اردو کا بھی ایسا ہی اچھا ادیب ہے جیسے ہندی کا اور جو اُن لوگوں میں سے ہے

جو ہندستانی زبان کے فروغ کے حامی ہیں۔ مجھے اس کی زبان پر مطلق اعتراض نہیں، یہ بہت صحیح اور فصیح ہندی ہے لیکن اسے ہندستانی کہنا لوگوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنا ہے۔ ممکن ہے کہ مہاتما گاندھی جو توجیہہ و تاویل کے فن کے استاد کامل ہیں لفظ انتھوا (یا) کے کچھ اور معنی پیدا کریں ورنہ بحالتِ موجودہ ہندی یا ہندستانی کا کوئی دوسرا مفہوم نہیں ہوسکتا۔ زبان کا آسان یا مشکل ہونا ایک دوسری بات ہے۔ ہر ایک کا ایک اسلوبِ بیان یا طرز تحریر ہوتا ہے اور خاص کر ادبی اور سائینٹفک مضامین میں لامحالہ زبان مشکل ہوجاتی ہے لیکن جو تحریر جس زبان میں ہے اسے اسی زبان سے منسوب کرنا مناسب ہے۔ لفظوں کے داؤ پیچ سے غلط فہمیاں پیدا کرنا درست نہیں۔ میں یہ بھی عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں تک مجھے علم ہے "ہنس" کے قابل اڈیٹروں نے اپنے رسالے کی زبان کو کبھی ہندستانی نہیں کہا۔ یہ مہاتما گاندھی ہیں جو "ہنس" کی زبان کو ہندستانی کہتے ہیں اور ایسی بڑی جسارت ایسا ہی بڑا آدمی کرسکتا ہے اگرچہ ہمیں ہنس کے اڈیٹروں کے اس قول کے تسلیم کرنے میں بہت تامّل ہے کہ اب ہندی زبان تمام ہندستان کی عام زبان ہوگئی ہے۔

اس رنگ کو (یعنی سیاسی رنگ کو) اور گہرا کرنے کے لیے اکثر اوقات، اور عموماً مذہب کی پُٹ دی جاتی ہے۔ جس زمانے میں شُدھی اور سنگھٹن کا زور تھا اس بدعت نے بھی زور پکڑا۔ اگرچہ شدھی اور سنگھٹن کا مقصد ہندوؤں کی تنظیم اور تقویت اور ہندو مذہب کی تبلیغ تھا، لیکن زبان بھی اس کی لپیٹ میں آگئی۔ اگر آپ شدھی اور سنگھٹن کے قبل کے ہندی ادب کا مقابلہ بعد کے ہندی ادب سے کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ہندی کی اصل اشاعت و ترقی اسی وقت سے شروع ہوئی ہے۔ جب کوئی وار کارگر نہیں ہوتا تو مذہب اور سیاسیات کی آڑلی جاتی ہے۔ لوگوں کو اُکسانے اور اُن میں جوش پیدا کرنے کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی

چلتا ہوا عمل نہیں ہے۔ زبان کو جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں انسانی ضرورت نے پیدا کیا اور زبان اور اس کے ادب کا ارتقا زمانے کی ضروریات اور حالات و افکار کے تابع رہا اور آئندہ بھی رہے گا۔ مذہب کے نام سے یا سیاسیات کے پردے میں اس کی اشاعت کا پراپیگنڈا کرنا خصوصًا ایسے زمانے میں جب کہ نفاق کی آگ ملک میں بھڑک رہی ہے دانشمندانہ فعل نہیں ہے۔ اس قسم کی تحریکوں سے نہ صرف اردو دان طبقے کو صدمہ پہنچا بلکہ نیشنل کانگریس کی اس قرارداد کی بھی بے وقعتی ہوئی جس کی رو سے "ہندستانی" ملک کی عام زبان قرار پائی تھی اور ہندستانی قومیت اور ہندستانی زبان و ادب کے بنانے کے لیے دلیرانہ اور دانشمندانہ پیش قدمی کی گئی تھی۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ ہندستانی کے معنی ہندی ہیں اور اس کی تائید میں مہاتما گاندھی کا بیان سب سے بڑی شہادت ہے۔

ابھی حال میں آپ کے پڑوس کے صوبے میں اسی قسم کا ہنگامہ بپا ہوا تھا۔ اس میں بھی سیاسی رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اگرچہ صوبہ سرحد کی مقامی زبان جسے وہاں کا تقریبًا ہر باشندہ بولتا اور سمجھتا ہے پشتو ہے یا پنجابی، اب جو انھوں نے اپنی مقامی زبان ترک کرکے اُردو کو اپنے نصابِ تعلیم میں داخل کیا ہے تو ان کا یہ فعل قابلِ تعریف ہے نہ لایقِ مذمّت۔ اُنھوں نے بڑی اخلاقی جرأت سے کام لیا ہے اور محض ہندستانی قومی زبان کی خاطر اتنی بڑی قربانی کی ہے۔ جو لوگ ہندستانی قومیت کے خواب دیکھ رہے ہیں اُنھیں خوش ہونا چاہیے کہ صوبۂ سرحد نے اس طرف سب سے پہلے قدم بڑھایا ہے۔ اس معاملے کے متعلق میں کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتا کیونکہ آپ مجھ سے بہتر ان باتوں کو جانتے اور سمجھتے ہیں۔

ایک اور تازہ واقعہ سُنیے کہ مسلمانوں نے دہلی کے نشر گاہ (یعنی

براڈکاسٹنگ سٹیشن) کی زبان کے متعلق ایک شاخسانہ نکالا ہے سننے والوں نے نہیں بلکہ اسمبلی کے بعض ممبروں نے۔ وہی سیاسی رنگ! ۔ سنا جاتا ہے کہ اس زبان پر جسے کبھی ہندستان کی عام زبان بنانے کا ارادہ تھا، نزلہ گرنے والا ہے اور اس کے پروگرام میں اس قسم کی تبدیلی ہونے والی ہے کہ اردو یا ہندستانی برائے نام رہے اور اس کی جگہ مہاتما گاندھی کی ہندی (یا ہندستانی) کو دے دی جائے۔ اور اس میں انھیں کامیابی ہو جائے گی کیونکہ آج کل اخباروں کی چیخ پکار اور ارکان اسمبلی کے سوالات بڑی وقعت رکھتے ہیں۔ اردو داں طبقہ کو اپنے اخباروں کی خبر لینی چاہیے اور انھیں زیادہ بہتر اور باوقعت بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس زمانے میں یہ بہت بڑی قوت ہے۔

ہر شخص کو اور ہر قوم کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی زبان کی اشاعت و ترقی کے لیے ہر جائز ذریعہ کو استعمال کرے اور جہاں تک اس کی قدرت میں ہو اس کی بہتری کے لیے کوشش کرے لیکن کسی فرد یا جماعت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی زبان کی محبّت یا جنون میں دوسری زبانوں کی تخریب کے درپے ہو اور وفد لے کر والیانِ ریاست کی خدمت میں حاضر ہو اور اصرار کرے کہ وہ اپنے علاقوں سے اردو زبان کو خارج کر کے ہندی داخل کرلیں۔ اردو داں طبقہ کبھی اس کا مرتکب نہیں ہوا۔ ہم کسی زبان کے مخالف نہیں، البتہ اپنی زبان کی ترقی کے خواہاں ہیں اور اس معاملے میں کامل رواداری اور آزادی کے قائل ہیں۔

اسی ضمن میں رسم خط کا مسئلہ بھی آجاتا ہے۔ آج کل اس پر بڑی پرزور بحثیں ہو رہی ہیں جن میں سے بعض دلچسپ اور کارآمد ہیں۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی تان اردو رسم خط ہی پر کیوں توڑی جاتی ہے۔ یہ مسئلہ ہندستان کے تمام رسوم خط سے متعلق ہے جہاں متعدد اور مختلف تحریر کے طریقے رائج ہیں خصوصاً

جنوبی ہند میں جس کا تعلّق نہ اُردو رسم خط سے ہی نہ دیونا گری سے - ہندستان کی تمام زبانوں کے لیے کسی ایک رسمِ خط کا ہونا ممکن تو ہی لیکن اس کا عمل میں آنا بہت دشوار ہی۔ مثالاً میں آپ کو ایک پُرلطف لطیفہ سناتا ہوں مسٹر ہری گووِل ٹائپ حرُوف اور اس کی طباعت کے بڑے ماہر ہیں۔ انھوں نے حال میں بنگالی اور ہندی کا ٹائپ تیار کیا ہی جو بہت قابل قدر ایجاد ہی۔ انھوں نے رسالۂ "وشال بھارت" کلکتہ میں دیوناگری رسم خط کی تائید میں ایک مفصّل مقالہ لکھا ہی جس کے ضمن میں انھوں نے یہ بحث کی ہی کہ مسلمان جو یہ کہتے ہیں کہ دیوناگری رسم خط اختیار کرنے سے ان کے کلچر کو صدمہ پہنچے گا، یہ بالکل غلط خیال ہی۔ رسم خط کو کلچر سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بحث کرتے کرتے وہ رومن رسم خط پر آتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ رومن رسمِ خط اختیار کرنے سے ہندو تہذیب اور کلچر کو سخت نقصان پہنچے گا۔ کیا عجیب بات اور کیسی عجیب منطق ہی۔ میں قابل مقالہ نویس کو "حافظہ نباشد" کا الزام نہیں دیتا لیکن اتنا ضرور عرض کرتا ہوں کہ دلوں کی تہوں میں جو بات چھپی ہوئی تھی اس کا راز کس سادہ لوحی سے طشت ازبام ہوگیا۔ جب تک اس خیال اور دماغ کے لوگ ہم میں موجود ہیں (خواہ وہ کسی طبقے یا فرقے کے ہوں) اس وقت تک ملک کی ساری زبانوں کے لیے کسی ایک رسم خط کا ہونا محال ہی۔

رہا اردو رسم خط تو یہ آج کا نہیں ہی۔ جب سے یہ زبان پیدا ہوئی یہ اس کے ساتھ ہی۔ اور یہ زبان جیسا کہ معلوم ہی اور ظاہر ہی ٹھیٹ ملکی زبان ہی۔ ہندو مسلمانوں کی مشترکہ مِلک ہی، دونوں کو اُن کے بزرگوں سے میراث میں ملی ہی اور یہ رسمِ خط بھی اُسی کے ساتھ آیا ہی جسے دونوں یکساں طور پر استعمال کرتے رہے اور کرتے ہیں۔ اس میں ایک کو دوسرے سے شکایت کا موقع ہی نہیں۔ ہاں یہ ممکن ہی

کہ ایک وقت ایسا آئے کہ جب ہندستان کی سب زبانوں کا رسم خط ایک ہوجائے لیکن اس وقت کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کب آئے گا اور اس کی کیا صورت ہوگی۔ البتہ یہ میں مانتا ہوں کہ فی الحال اصلاحِ رسم خط کا مسئلہ قابلِ غور اور نہایت ضروری ہے۔

دنیا کا کوئی رسم خط کامل نہیں اور ہم بھی یہ دعوے نہیں کرسکتے کہ ہمارا رسم خط بے عیب ہے۔ ہر زندہ زبان اور زندہ شے میں تغیر و تبدّل اور اصلاح کا ہونا لازم ہے۔ البتہ مُردے میں کسی تغیرّ و تبدّل کی گنجائش نہیں ہوتی کیونکہ نمو کا اس میں امکان ہی نہیں۔ اگر ہم اپنے رسمِ خط کا سُراغ لگاتے لگاتے اُس ابتدائی صُورت تک پہنچیں جہاں سے اُس نے آگے بڑھنا شروع کیا اور پھر اس طرف سے چلیں اور ہر قرن اور ہر عہد کے رسم خط کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ رفتہ رفتہ ہر عہد میں تغیّر ہوتا گیا ہے اور جب ہم موجودہ رسم خط تک پہنچیں گے اور اس کا مقابلہ ابتدائی صورت سے کریں گے تو زمین آسمان کا فرق معلوم ہوگا۔ آپ دُور کیوں جائیں۔ خود اُردو رسمِ خط کو دیکھیے۔ کیا یہ ابتدا سے اب تک اُسی ایک حالت میں ہے؟ پُرانی تحریریں دیکھیے، سو ڈیڑھ سو برس بلکہ تیس چالیس برس پہلے کی چھپی ہوئی کتابیں ملاحظہ فرمائیے۔ کیا اس وقت سے اب تک کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہوا؟ یہ فرق کیوں ہوا اور کس نے پیدا کیا؟ زمانے کے حالات اور خود ہماری ضرورتوں نے ہمیں اصلاح سے کبھی مُنہ موڑنا نہیں چاہیے اور اس کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔ چنانچہ ہندی والوں نے بھی جنھیں اپنے رسم خط کے کامل ہونے کا دعویٰ تھا اس بات کو محسوس کیا اور ہندی سمیلن نے ایک خاص کمیٹی اس غرض سے مقرر کی ہے کہ وہ غور و فکر کے بعد مناسب اصلاحیں تجویز کرکے پیش کرے۔ اسی طرح ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور کی

تحریک پر کلکتہ یونیورسٹی نے ایک کمیٹی کا اسی مقصد سے تقرر کیا ہے کہ وہ بنگالی رسم خط پر غور کرکے ضروری اصلاحیں تجویز کرے۔ میں اس وقت اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کرنا نہیں چاہتا کیونکہ قریب زمانے میں انجمن ترقیٔ اُردو منتخب اصحاب کی ایک کانفرنس کرنے والی ہے جس میں اُردو زبان کی اصلاح اور ترقی و اشاعت کے متعلق متعدد تجاویز پیش کی جائیں گی۔ اسی میں یہ مسئلہ بھی زیرِ بحث آئے گا۔ بعض صاحبوں نے اس مسئلہ پر بہت غور و خوض کیا ہے اور کافی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ انجمن حمایت اسلام بھی اپنے نمائندے بھیج کر اس کانفرنس میں شریک ہوگی۔ بہرحال ہمیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ اگر ہمیں اپنی زبان کی اشاعت منظور ہے تو ہمیں ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کوئی زبان ایک ہی حالت میں ایک جگہ کھڑی نہیں رہ سکتی۔ اُسے زمانے کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے ورنہ اس کی قسمت میں فنا ہونا لکھا ہے۔

اس وقت زبان کی اشاعت کے تین عام ذریعے ہو سکتے ہیں۔ ایک اخبارات کا جن کا پیام گھر گھر پہنچتا ہے، جن کے خیالات جتنے کہ ان کے الفاظ اور جملے چند ہی روز میں زبان زد خاص و عام ہوجاتے ہیں۔ دوسرا ذریعہ عام ابتدائی تعلیم ہے۔ یہ اُن تعلیمی کانفرنسوں کا کام ہے جو ہر صوبے میں قائم ہیں۔ بجائے فضول قصیدہ خوانی اور ٹھنک ٹھنک کر اشعار پڑھنے اور لہک لہک کر وعظ کہنے کے ان کانفرنسوں کا خاص کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ قصبے قصبے اور گانو گانو میں ابتدائی مدارس کے سلسلے قائم کردیں۔ انھیں چھوٹے چھوٹے مدارس میں ہماری قومی زبان کی نشو و نما اور قومی بہبودی کی بنیاد پڑے گی۔ جب تک تعلیم عام نہ ہوگی اس وقت تک نہ آپ کے اخبار کام آئیں گے اور نہ

آپ کی کتابیں زیادہ مقبول ہوں گی۔ تیسرا ذریعہ سینما ہے۔ لہو ولعب سمجھ کر اس سے بے اتفاقی کرنا درست نہ ہوگا۔ ہمارے اخبار اور کتابیں وہیں کام آسکتی ہیں جہاں پہلے سے تعلیم موجود ہے لیکن فلم وہاں بھی کارآمد ہوسکتا ہے جہاں تعلیم مفقود ہے۔ اوّل اوّل سینما کو رونق دینے والی ہماری ہی زبان تھی لیکن بعد میں بعض وجوہ کی بنا پر جن سے میں بحث نہیں کرنا چاہتا اور جس میں ہمارا بھی قصور ہے، اس کا رُخ دوسری طرف پھر گیا۔ اب بھی وقت ہے کہ ہم اس کی طرف توجہ کریں۔ ہمارا فرض ہے کہ زمانے کے حالات کو دیکھ کر ہر ایسے ذریعے سے کام لیں جو ہماری زبان کی اشاعت کے لیے مفید ہو۔

حضرات! یہ وقت ہماری زبان پر بہت نازک ہے کچھ مشکلات اندرونی ہیں اور کچھ بیرونی۔ اس سے ہماری ذمہ داری بہت کٹھن ہوجاتی ہے۔ اس ذمہ داری کا حق ادا کرنے کے لیے ہمیں ہر قسم کی جوکھم جھیلنے اور ضرورت کے وقت ہر قسم کی قربانی کرنے کے لیے آمادہ رہنا چاہیے۔ اور کچھ نہیں تو ہر پڑھے لکھے کو یہ عہد کرلینا چاہیے کہ وہ ہر سال اور یہ نہ ہوسکے تو پانچ سال یا دس سال میں یا یہ بھی ممکن نہ ہو تو عمر بھر میں کم سے کم ایک شخص کو اُردو لکھنا پڑھنا سکھا دے گا۔ اگر ہم دل پر رکھ لیں تو یہ کوئی بڑی بات نہیں لیکن اس کے نتائج عظیم الشان ہوں گے۔

زبان کا کوئی رنگ رُوپ (ورن) نہیں۔ اس کی کوئی ذات نہیں، اس کی کوئی قومیت نہیں، اس کا کوئی مذہب اور وطن نہیں، جو اسے بولے، لکھے پڑھے اور استعمال کرے گا، اسی کی وہ زبان ہوگی۔ اگر آپ کی زبان میں یہ خواص ہیں اور ساتھ ہی اس میں بڑھنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت ہے تو یہی ہندستان کی زبان ہوکے رہے گی ۔

خطبۂ صدارت انجمن ترقی پسند مصنفین ہند

(ترقی پسند ادیبوں کا پہلا جلسہ ماہ اپریل ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ میں ہوا تھا۔
شعبۂ اردو کی صدارت کے لیے انھوں نے مولانا عبدالحق صاحب کو
طلب کیا تھا۔ مولانا جانے کے لیے تیار تھے لیکن عین وقت پر ایک
ناگریز وجہ سے شریک نہ ہوسکے۔ اس جلسے کے لیے جو خطبہ مولانا
موصوف نے تحریر فرمایا تھا وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہی۔)

مرتّب

میرے نوجوان رفیقو اور دوستو!

آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ ایک بڈھا کہیں جارہا تھا، چلتے چلتے رستے میں کہیں ٹھوکر لگی اور گر پڑا۔ اس وقت بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا "ہائے رے جوانی"، پھر جھٹ اُٹھ کر اِدھر اُدھر نظر ڈالی اور جب دیکھا کہ کوئی نہیں ہی تو کہنے لگا "جوانی ہی میں کون سے تیر مارے تھے"۔ جب میں ایسے قابل نوجوانوں کی جماعت اپنے سامنے دیکھتا ہوں جیسی کہ اس وقت میرے سامنے ہی تو مجھے وہ شریف بڈھا یاد آتا ہی۔ ایک دو بار نہیں بارہا میں نے یہ کہتے سنا ہی کہ پہلے کے نوجوان (یعنے تیس چالیس برس پہلے کے) زیادہ قابل ہوتے تھے۔ میں نے اس کی ہمیشہ تردید کی۔ بات یہ ہی کہ انسان طبعًا گزشتہ سے بہت حسن ظن رکھتا ہی اس کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو تو بھول جاتا ہی اور خوبیاں یاد رہ جاتی ہیں۔ مثلاً

یہی وجہ ہے کہ سارے ہندستان میں بچوّں کا کوئی اچھا مدرسہ نہیں۔ بچپن میں جو ہمیں قدم قدم پر مشکلات پیش آئی تھیں وہ بڑے ہوکر بھول گئے اور یاد رہا تو یہ کہ مکتب میں خوب پٹتے تھے اور جب ہمیں پڑھانے کا موقع ملا تو ہم نے بھی خوب کان اینٹھے اور قمچیاں لگائیں۔ یہ کچھ انسان کی فطرت سی ہوگئی ہے کہ گزشتہ کو سراہتا اور حال کو سراپتا ہے۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ آج کل کے نوجوانوں میں جو عقل و شعور اور مستعدی ہے وہ میرے طالب علمی کے زمانے کے نوجوانوں میں نہیں تھی۔ اس لیے مجھے آپ کی جوانی پر نہیں، آپ کی ذہانت، طبّاعی اور مستعدی پر رشک آتا ہے۔ میں جب کسی قابل نوجوان کو دیکھتا ہوں تو میرا جی باغ باغ ہوجاتا ہے، مگر اس کے ساتھ ہی مجھے یہ حسرت ہوتی ہے کہ کاش اس عمر میں اگر مجھ میں اتنی قابلیت ہوتی تو میں بہت کچھ کرسکتا تھا، لیکن گیا وقت اور خاص کر جوانی کبھی واپس نہیں آتی تو پھر میں نے گزشتہ کی تلافی، نہیں بلکہ کفّارے کی یہ تدبیر سوچی کہ بدنصیبی سے جب میں خود کچھ نہ کرسکا تو لاؤ میں نوجوانوں کی خدمت کیوں نہ کروں جو بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ صاحبو! یہی وجہ ہے کہ میں آپ کے ارشاد پر آپ کی خدمت میں اس طرح کھنچا چلا آیا جیسے حاتم طائی کے قصے میں بعض جانہار کوہ ندا کی صدا پر کھنچے چلے جاتے تھے۔

ادب ہو یا زندگی کا کوئی اور شعبہ اس میں ترقی پذیری کی قوت اُسی وقت تک ہوتی ہے جب تک اس میں تازگی، جِدّت اور توانائی پائی جاتی ہے۔ اور تازگی اور جِدّت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ ہمارے پیشِ نظر کوئی خاص مقصد ہو جس پر ہمارا ایمان ہو اور جس کے حصول کے لیے ہم ہر قسم کی قربانی کے لیے آمادہ ہوں۔ جب کوئی خاص مقصد پیشِ نظر نہیں ہوتا تو جِدّت،

تازگی اور توانائی بھی رخصت ہوجاتی ہے اور زندگی کے کاموں میں یکسانی اور مساوات سی پیدا ہوجاتی ہے۔ ایک ہی لکیر کو پیٹتے پیٹتے انسان اُکتا جاتا ہے اور اس بیزاری کے عذاب سے بچنے کے لیے وہ عیاشی اور طرح طرح کی لغویات میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ اس وقت آثارِ حیات گھٹنے لگتے ہیں، قویٰ میں انحطاط پیدا ہونے لگتا ہے، دل میں امنگ نہیں رہتی، دل و دماغ کے اُبھارنے کے لیے طرح طرح کے محرکات استعمال کیے جاتے ہیں لیکن وہ سب عارضی اور بے نتیجہ ہوتے ہیں۔ آخر اسی عالمِ نیم جانی میں اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ یہ اصول افراد، اقوام اور زندگی کے ہر شعبے پر صادق آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ روما کی عظیم الشان سلطنت کی تباہی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اہلِ روما جو کچھ کرنا تھا کر چکے اور ان کے پیشِ نظر کوئی خاص مقصد نہیں رہا تھا۔ اس لیے وہ لہو و لعب اور عیّاشی میں مبتلا ہوگئے۔ اولوالعزمیاں جاتی رہیں، حوصلے پست ہوگئے، کاہلی میں جس کا دوسرا نام عیّاشی ہے، مزہ آنے لگا۔ انحطاط نے استقبال کیا اور زوال نے انھیں لے جاکر دفن کردیا۔

ہمارے اُصول، عقائد اور خیالات کیسے ہی اعلیٰ اور پاکیزہ کیوں نہ ہوں اور خواہ وہ ہمیں کیسے ہی عزیز کیوں نہ ہوں اگر زمانے کے اقتضا کے مطابق ان میں جدّت اور تازگی پیدا نہیں کی جائے گی تو ایک روز بند پانی کی طرح ان میں سڑاند پیدا ہونے لگے گی اور ان میں ایسے زہریلے جراثیم پیدا ہوجائیں گے جو ان کی ہلاکت کا باعث ہوں گے۔ بندریا کو اپنے بچّے سے بڑی محبّت ہوتی ہے۔ یہ محبّت جنون کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ بچّہ مرجاتا ہے تو بھی اسے جُدا نہیں کرتی اور اپنے سینے سے چپٹائے پھرتی ہے۔ آخر اس میں تعفّن پیدا ہوجاتا ہے اور اس کا ایک ایک عضو گل سڑ کر گرنے لگتا ہے۔

یہی حال افراد، اقوام اور زندگی کے ہر شعبے کا ہوتا ہے۔ جب لوگ اپنے مرغوب رسم و رواج اور توہمات کو سینے سے چپٹائے پھرتے ہیں تو وہ تو خیر زمانے کی دستبرد سے گل سڑکے گر ہی جاتے ہیں مگر وہ خود بھی انھیں کے ساتھ فنا ہو جاتے ہیں۔

ایک شخص کو تسخیر جن کا بہت شوق تھا اور اس کا عمل حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بہت دنوں کے بعد اسے ایک عامل ملا، بڑی خوشامد اور خدمت کے بعد یہ عمل سکھایا۔ سنا ہے کہ یہ عمل بہت سخت ہوتا ہے اور اکثر اس میں جان کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس نے شوق کی دُھن میں یہ سب تکلیفیں سہیں اور جن کو تسخیر کرکے رہا۔ جن دست بستہ حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ فرمائیے کیا ارشاد ہے جو حکم ہوگا اسے بسروچشم بجالاؤں گا۔ عامل صاحب بہت خوش ہوئے اور انھوں نے اپنی دانست میں بڑے مشکل مشکل کام اسے بتائے، جن نے جھٹ پٹ کردیے اور اور کام لینے کے لیے حاضر ہوگیا۔ کہتے ہیں کہ جن کبھی نچلا نہیں بیٹھتا۔ ہر وقت اس کے لیے کچھ نہ کچھ کام ہونا چاہیے۔ اگر کام نہ دیا جائے تو وہ ستانا شروع کرتا ہے اور شرارتیں کرنے لگتا ہے۔ عامل صاحب کچھ نہ کچھ کام دیتے رہے مگر اس جن کے لیے جو ہر وقت "ھل من مزید" کی صدا دیتا تھا، اتنے کام کہاں سے لاتے۔ اب جن نے انھیں ستانا شروع کیا اور وہ بہت پریشان ہوئے۔ آدمی تھے ذہین، انھیں ایک تدبیر بہت خوب سوجھی۔ کہا کہ ہمارے صحن میں جو املی کا درخت ہے اس پر اُترو اور چڑھو اور چڑھو اور اُترو۔ اور جب تک ہم حکم نہ دیں برابر اُترتے چڑھتے رہو۔ کچھ دن تو وہ اُترتا چڑھتا رہا، لیکن کب تک۔ آخر اس قدر عاجز اور تنگ ہوا کہ چیخ اٹھا اور عامل صاحب کی دہائی دینے لگا کہ خدا کے لیے مجھے اس

عذاب سے بچایئے، آپ جو کہیں گے وہی کروں گا۔ عامل صاحب نے حکم دیا کہ اچھا اب اترنا چڑھنا بند کردو۔ جب ہم کسی کام کا حکم دیں تو اسے کرو ورنہ چپ چاپ یہاں بیٹھے رہو۔ بے کار بیٹھے بیٹھے وہ اکتا جاتا تو شرارت کی سوجھتی، مگر معًا املی کے درخت کا خیال آتا تو وہیں دبک کے بیٹھ جاتا۔ اب بے کاری کی وجہ سے جن صاحب کا یہ حال تھا کہ کونے میں بیٹھے اونگھا کرتے، اور منہ پر مکھیاں بھنکتی رہتی تھیں۔

یہ قصّہ جھوٹ سہی، لیکن نہایت سبق آموز ہے۔ اوّل یہ کہ کام کی یک رنگی اور یکسانی ایسی بد بلا ہے کہ جن جیسے ہستی جس میں توانائی اور مستعدی کوٹ کوٹ کے بھری ہے وہ بھی اس سے عاجز آجاتی ہے۔ دوسرے بیکاری انسان کے قویٰ کو مضمحل اور بے کار اور شوق اور اُمنگ کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں حیات کی دشمن ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ توانائی آدمی کو نچلا نہیں بیٹھنے دیتی، اس کا اقتضا ہے کہ کچھ نہ کچھ کیا جائے۔ یہ انسان کی تمیز و شعور پر ہے کہ کونسا ایسا کام کرے جو ممد حیات ہو۔ اگر وہ املی کے پیڑ پر اترتا چڑھتا رہا تو سمجھو کہ کھویا گیا۔

ممد حیات وہ کام ہے جن میں تازگی اور جدت ہوتی ہے اور جو اپنے اثر سے لوگوں کے خیالات اور عمل میں تازگی اور جدت پیدا کرتے اور نئی راہیں سجھاتے ہیں اور شوق کو مردہ نہیں ہونے دیتے۔ آپ نے ادب کو اپنا مقصد قرار دیا ہے۔ یہ بھی ممد حیات کاموں سے ہے اس سے بڑے بڑے کام نکل سکتے ہیں، دلوں میں امنگ، اور خیالات میں انقلاب پیدا کرسکتے ہیں۔ زندگی کو زیادہ پرلطف اور زیادہ کارآمد بنا سکتے ہیں اور ملک و قوم کو ترقی کے رستے پر لگا دینے میں مدد کرسکتے ہیں۔ لیکن ادب وہی کارآمد ہوسکتا اور

زندہ رہ سکتا ہی جو اپنے اثر سے حرکت پیدا کرنے کی قوت رکھتا ہی اور جس میں زیادہ سے زیادہ اشخاص تک پہنچنے اوران میں اثر پیدا کرنے کی صلاحیت ہی۔ ترقی پذیر ادب کی یہی تعریف ہوسکتی ہی۔

لیکن ترقی کا رستہ بہت دشوار گزار، تنگ اور کٹھن ہی۔ یہاں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا ہوتا ہی۔ یہ بڑے صبر اور استقلال اور بہت پتّا مارنے کا کام ہی۔ باوجود ان اوصاف کے وہ حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ آزادی نہ ہو۔ ترقی سرزمینِ آزادی ہی میں پھول پھل سکتی ہی۔ ادیب کو اگر آزادی نہیں تو اس کی حالت مفلوج کی سی ہی۔ ادیب کو حق حاصل ہی اور اسے آزادی ہونی چاہیے کہ جو چاہے لکھے۔ لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں ہی کہ وہ کسی چیز کو بھونڈے پن سے لکھے۔ "بھونڈے پن" کے لفظ میں ادب کے ظاہر اور باطن دونوں کی قباحتیں آجاتی ہیں۔ اگر اس سے بچنا ممکن ہی تو وہ ادب قابل مبارک باد ہی۔ ترقی پسند مصنّفین کو یہ نکتہ پیش نظر رکھنا چاہیے ورنہ ان کی بہت سی محنت اکارت جائے گی۔

آپ کو اپنے خیالات صرف تعلیم یافتہ طبقے تک محدود نہیں رکھنے چاہییں بلکہ اس کثیر طبقے تک بھی پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیے جو ان سب نعمتوں سے محروم ہی جو آپ کو حاصل ہیں۔ تعلیم عام نہ ہونے سے اس میں آپ کو بہت دشواری پیش آئے گی۔ لیکن پھر بھی ان کا خیال مقدم ہی اس لیے کہ ان کے دلوں میں جو ابھی بہت سی آلائشوں سے پاک ہیں ان خیالات کا جانا آسان ہی بہ نسبت اُن لوگوں کے جو کہلاتے تو تعلیم یافتہ ہیں مگر زنگ آلودہ ہیں۔ اس پر آپ کو اپنی کانفرنس میں غور کرنا ہوگا۔ یہ نہایت دشوار کام ہی اور اس کام کو انجام دینے والے بہت مشکل سے ملیں گے۔

زندگی مسلسل ہے اسی طرح ادب بھی مسلسل ہے۔ اس لیے گزشتہ کا مطالعہ حال کے سمجھنے میں اور ماحول کا مشاہدہ حال کی اصلاح اور آیندہ کی تیاری میں مدد دے گا۔ ممکن ہے کہ زندگی کے بعض شعبوں میں سراسر تخریب اور استیصال کارآمد ہو۔ یعنے جب تک ہر پُرانی چیز کو جڑ سے اکھاڑ کر نہ پھینک دیا جائے، نئی تحریک سرسبز نہیں ہوسکتی۔ اس کی مثال عموماً یہ دی جاتی ہے کہ جب تک پُرانا بوسیدہ مکان بالکل نہ ڈھا دیا جائے نئی تعمیر نہیں بن سکتی۔ یہ تشبیہ ممکن ہے کہ بعض صورتوں میں درست ہو لیکن ادب کے معاملے میں یہ کامل طور پر منطبق نہیں ہوسکتی۔ ترقی کے لیے تخریب ضروری ہو مگر لازم نہیں۔ ادب میں بیشک آپ کو نئے اسلوب، نئے خیالات پیدا کرنے ہوں گے اور بہت سے پُرانے مضر خیالات اور توہمات کی بیخ کنی ہوگی۔ سوکھی شاخیں چھانٹنی ہوں گی اور مرجھائی ہوئی ٹہنیوں کو پانی دے دے کر پھر ہرا کرنا ہوگا اور درخت کی جڑ میں کھاد اور پانی ڈال کر سرسبز کرنا ہوگا تاکہ نئی کونپلیں اور نئے پتے پھوٹیں۔ لیکن اگر آپ درخت ہی کو جڑ سے کاٹ ڈالیں گے تو کام کا موقع کہاں رہے گا۔ ہمیں پچھلوں کے کام اور اُن کی محنتوں سے حسب ضرورت ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے اور ایسے ادب کی بنیاد ڈالنی چاہیے جو ہماری زندگی میں تازگی پیدا کرے اور ہماری جدید ضروریات کے مطابق ہو۔ اور پھر آیندہ آنے والے اپنی نئی ضروریات اور حالات کے مطابق اس میں ترمیم و اصلاح کریں اور یہ سلسلہ برابر جاری رہے۔

مجھے معاف فرمائیے گا، میں دیکھتا ہوں کہ اکثر ترقی پسند نوجوان اپنے خیالات کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ جو دل میں ہے وہ بیان میں نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ وہ یہ جواب دیں کہ ہمارے خیالات اس قدر اعلیٰ ہیں

کہ عام فہم سے بالا ہیں۔ میں اسے تسلیم نہیں کرتا اور غالباً کوئی بھی تسلیم نہ کرے گا۔ ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ کیوں ایسا ہے۔ یہ ایک عام اور معمولی بات ہے لیکن کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ہر پرانی چیز بری نہیں اور ہر نئی چیز اچھی نہیں ہوتی۔ رجعت یا ترقی کوئی نئی چیز نہیں۔ رجعت پسند اور ترقی پسند ہر زمانے میں ہوئے ہیں، اب ہیں اور آیندہ بھی ہوتے رہیں گے۔ رجعت اور ترقی اضافی چیزیں ہیں۔ کائنات کا ہر ذرّہ حرکت میں ہے اور ہر چیز پر تغیر کا عمل جاری ہے۔ رجعت یا ترقی ہر زمانے کے حالات اور ماحول کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ یہ خیال کہ ہر چیز جس کا تعلق گزشتہ زمانے سے ہے، سراسر رجعت سے آلودہ ہے، صحیح نہیں۔ محض اس بنا پر کہ ہم لوگ آگے بڑھ گئے ہیں گزشتہ سے اپنا تعلق بالکل قطع نہیں کرنا چاہیے۔ ایسا کرنا اپنی جڑیں کاٹنا ہے۔ ہم گزشتہ کے وارث ہیں۔ اگر کوئی وارث اپنے ارث سے بے خبر ہے یا کما حقہٗ واقفیت نہیں رکھتا تو خواہ وہ کیسا ہی ذہین مستعد اور انقلاب پسند کیوں نہو، نہ کوئی اصلاح کرسکتا ہے، نہ خود فائدہ حاصل کرسکتا ہے، اور نہ دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ اس لیے ہر ترقی پسند ادیب کا فرض ہے کہ گزشتہ تاریخ اور گزشتہ ادب کا غور سے مطالعہ کرے اور دیکھے کہ ہمارے ادب میں کہاں تک آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے، کن چیزوں کا ترک کرنا مناسب ہے اور کن ذرائع سے اسے بلند مقام تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ جو چیز آپ کو ارثاً ملی ہے، اگر آپ اس کے حسن و قبح سے واقف نہیں تو اصلاح کس کی اور انقلاب کیسا؟ لیکن "میراث پدر خواہی علم پدر آموز" ہی کافی نہیں، "علم پسر آموز" بھی لازم ہے۔ ہم صرف حال ہی کے سامنے جواب دہ نہیں، آئندہ کے بھی جواب دہ ہیں۔ اس لیے زندگی کے جس شعبے میں بھی ہم ہاتھ ڈالیں، ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم دیکھیں کہ ہمارے اعمال و افعال کا

اثر آیندہ نسلوں پر کیا ہوگا، کیونکہ آیندہ زمانے میں ہمارے کاموں کی تنقیح و تنقید اسی اصول پر ہوگی۔

دوسری چیز جو آپ کے قابل غور ہی یہ ہو کہ جس زبان میں آپ اپنے خیالات ادا کرنا چاہتے ہیں اس پر پوری قدرت ہو۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہو کہ جب ہم اپنے گزشتہ ادب کو اس نظر سے مطالعہ کریں گے۔ زبان کیا ہی؟ خیال کے ادا کرنے کا آلہ۔ اگر کسی کاریگر کا اوزار بھدّا ہی تو اس کا کام بھی بھدّا ہوگا۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہی کہ ہماری زبان میں ہمارے خیالات نہیں سما سکتے۔ کوئی زبان ایسی نہیں جس میں خیال ادا کرنے کی صلاحیت نہ ہو، بشرطیکہ کسی میں ادا کرنے کی صلاحیت بھی ہو۔ زبان بھی ارثاً ملی ہی اور جب تک ہم اس پر قدرت حاصل نہ کریں گے ہم اپنے خیالات ادا کرنے پر قادر نہ ہوں گے۔

ایک وجہ تو یہ ہی کہ ہم اپنے خیال کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہی کہ جس خیال کو ہم نے ادا کرنے کی کوشش کی ہی شاید وہ ہمارا نہیں، اصل نہیں نقل ہی، شاید مستعار ہی، کہیں سے بہتا ہوا چلا آیا ہی۔ ہمارے دل پر اس کا گہرا نقش نہیں، اس نے ہمارے دل میں گھر نہیں کیا۔ ورنہ ممکن نہ تھا کہ ادا نہ ہوتا۔ خیال اپنا ہو، یعنے جسے ہم نے خود سوچ کے پیدا کیا ہی یا کسی دوسرے کا، لیکن ہمارے دماغ میں اس قدر صاف اور روشن ہونا چاہیے کہ جس وقت ہم لکھنے بیٹھیں تو صفحۂ کاغذ پر موتی کی طرح ڈھلکتا ہوا نظر آئے۔ لیکن جب خیال ہی ہمارے دماغ میں صاف اور روشن نہیں ہوتا تو بیان لامحالہ تاریک اور مبہم ہوجاتا ہی۔ ظاہر ہی کہ ہر ادیب اپنی زبان کی صرف و نحو اور لغت سے واقف ہوتا ہی۔ لیکن اس میں سب سے بڑی چیز لفظ کا صحیح استعمال ہی۔ اسے معمولی بات نہیں

سمجھنا چاہیے۔ لکھنے والوں میں کم ایسے ہیں جو الفاظ کے صحیح استعمال سے واقف ہیں۔ لفظ ایک بڑی قوت ہے اور اس کا برمحل استعمال خیال میں قوت پیدا کر دیتا ہے۔ جو اس گُر سے واقف نہیں اور لفظ کے صحیح اور برمحل استعمال کو نہیں جانتا اس کا بیان اکثر ناقص، ادھورا اور بے جان ہوتا ہے۔

یہ دو چیزیں ہیں، ایک ادب کا ظاہر یعنے زبان اور دوسرے ادب کا باطن یعنے خیال۔ اگرچہ ان کو الگ الگ بیان کیا جاتا ہے لیکن یہ ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہوسکتیں، یہ لازم و ملزوم ہیں۔ انھیں کے میل سے اسلوب بیان یعنے اسٹائل بنتا ہے۔ اس لیے ترقی پسند نوجوانوں کی خدمت میں میری عرض ہے کہ وہ اپنے ادب اور زبان کا گہرا مطالعہ کریں ورنہ ان کی ساری کوششیں رائگاں جائیں گی اور ان کے خیالات خواہ کیسے ہی بلند اور انقلاب انگیز کیوں نہ ہوں پت جھڑ کی طرح ہوا میں بکھر جائیں گے۔

ادب و زبان کے علاوہ جو ایک بات میں آپ کی خدمت میں عرض کرنی چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ترقی پسند جماعت کو اپنے مقاصد کے عمل میں لانے کے لیے اخلاقی آزادی اور اخلاقی جرأت سے کام لینا پڑے گا۔ اگر آپ نے مقبولیت اور ہر دل عزیزی یا کسی قسم کی امداد حاصل کرنے یا اپنی تعداد بڑھا کر دکھانے کی خاطر ذرا بھی رجعت پسندی کی طرف میلان ظاہر کیا تو یاد رکھیے کہ معقول پسند اور حقیقی ترقی پسند لوگ آپ سے بدگمان ہو جائیں گے۔ اور اگر ابتدا میں یہ بدگمانی پیدا ہوگئی تو اس کے رفع کرنے میں بڑی مدت درکار ہوگی۔ بنیاد اگر بگڑ گئی تو عمارت کا خدا حافظ ہے۔ آپ کے ایک قابل رکن کا یہ کہنا کہ "ہم بعض حضرات کی رجعت پسندی سے ناواقف نہیں ہیں مگر ابھی ہم میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ صرف اپنے بل پر کھڑے ہوسکیں؛ تنہا اپنے عقائد کی پاکی یا استقامت سے ہمیں کوئی

اطمینان نہیں ہوتا، اس لیے کہ اگر یہ بڑھ کر سماج کے خیالات اور بنائے عمل نہیں بن سکتے تو اسی طرح بیکار رہیں گے جس طرح کوئی مذہبی عقیدہ،، سراسر غلط ہی نہیں گمراہ کن ہو۔ اگر آپ رجعت پسندی کے سہارے ترقی کی طرف جانا چاہتے ہیں تو شروع ہی میں سیدھے رستے سے بھٹک جائیں گے اور کبھی منزل مقصود تک پہنچنا نصیب نہ ہوگا۔ حیرت ہو کہ آپ رجعت اور ترقی کو ایک ساتھ کیسے نبھا سکتے ہیں۔ شاید تیل اور پانی کا ایک جا ہونا ممکن ہو لیکن رجعت اور ترقی کا ایک جا ہونا کسی طرح ممکن نہیں۔ یہ کھُلی مداہنت اور ریاکاری ہوگی اور یہی ایک چیز آپ کی ترقی پسندی کو بے وقعت کردے گی۔ اگر آپ کو" اپنے عقائد کی پاکی اور استقامت،، پر اطمینان نہیں تو بہتر ہو کہ آپ اس خیال کو ترک کردیں۔ رجعت پسندی کے بل کھڑے ہونے سے بہتر ہو کہ آپ نہ کھڑے ہوں۔

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است
رفتن بپائے مردی ہمسایہ در بہشت

سعدی اس خیال میں آپ سے کہیں بڑھا ہوا ہو۔ وہ تو ہمسایہ کی امداد سے بھی بہشت میں جانا پسند نہیں کرتا اور آپ رجعت پسندوں کی مدد سے جنت ترقی میں جانا چاہتے ہیں۔ یہ خیالات نہایت پستی اور کم ہمتی کے ہیں۔ آپ کو کوئی ضرورت تعداد بڑھانے اور شاخیں پھیلانے کی نہیں۔ اگر آپ کے ساتھ بارہ بلکہ بارہ بھی نہیں، تین چار بھی ثابت قدم اور راسخ العقیدہ شخص ہیں تو ہندستان بھر میں انقلاب پیدا کرسکتے ہیں۔ ایک ایک آدمی نے دُنیا کو ہلادیا ہو اور آپ اتنی تعداد میں ہوکر بھی رجعت پسندوں کی آڑ لیتے پھرتے ہیں۔

آپ کا کام اس وقت وہی ہو جو اٹھارھویں صدی عیسوی میں انسائیکلو پیڈیسٹ (Encyclopædist) نے فرانس میں کیا تھا۔ انھوں نے

رجعت پسندوں کے ہاتھوں کیسی کیسی سختیاں جھیلیں، قید میں رہے، جلا وطن کیے گئے۔ کتاب چھپنے کی ممانعت کردی گئی، آخری پروفوں میں تحریفیں کی گئیں اور اصل مسودے جلا دیے گئے۔ یہ سب سہا مگر اپنے عزم سے نہ پھرے۔ اس کتاب میں صرف معلومات ہی نہیں فراہم کی گئی تھیں بلکہ انسان کی روشن خیالی، خیالات کی انقلاب انگیزی اور توہمات و تعصبات کی بیخ کنی کا سامان بھی جمع کیا گیا تھا۔ اس کے مولفین کی غایت نظریات نہیں تھی بلکہ عمل تھا، ادبی شان دکھانی مقصود نہ تھی بلکہ ان کا منشا زندگی کی تعمیر تھی۔ یہ لوگ سچے مجاہد تھے۔ باوجود مسخ ہونے کے اس کتاب کا اثر صرف فرانس ہی تک نہیں رہا بلکہ دور دور تک پہنچا۔ انیسویں صدی میں جو عقلیت کی ہوا ہندستان میں چلی تھی، اس کا اگر آپ سراغ لگائیں گے تو اس کا سلسلہ بھی انھیں چند پاک نفوس تک پہنچے گا۔ اس کتاب کو اب کوئی نہیں پڑھتا اور بہت ہی کم ایسے لوگ ہوں گے جنھیں اس کی کبھی زیارت نصیب ہوئی ہوگی، لیکن اس کا اثر اور فیض اب تک جاری ہے۔

یہ صرف چند نفوس تھے۔ مگر دھن کے پکے اور عقیدے کے سچے تھے۔ ان کی زندگی کا مطالعہ کیجیے، ان کے کاموں کو دیکھیے اور ان کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کیجیے۔ کوئی وجہ نہیں کہ آپ کامیاب نہ ہوں۔
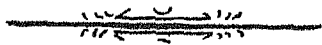
خطبۂ صدارت بہار اُردو کانفرنس

یہ خطبہ مولانا عبدالحق صاحب سیکرٹری انجمن ترقیٔ اُردو ہند صوبہ بہار کی اردو کانفرنس میں جو سید عبدالعزیز صاحب بیرسٹرایٹ لا وزیر تعلیم کی سرپرستی میں منعقد ہوا تھا پڑھ کر سنایا۔ ۱۹۳۶ء

مرتب

ای صاحبو!

ایک مشہور مثل ہی "دور کے ڈھول سہانے" یہ بالکل سچ ہی۔ لیکن جب یہی ڈھول بہت قریب آجاتے ہیں تو سخت ناگوار ہوتا ہی اور کان پھٹنے لگتے ہیں۔ مجھے ڈر ہی کہ کہیں یہ مثل مجھ پر صادق نہ آئے اگر ایسا ہوا تو اس کے ذمہ دار ہمارے محترم جناب سید عبدالعزیز صاحب، میرے مہربان قاضی عبدالودود صاحب اور امتیاز کریم صاحب ہوں گے جو اس بدعت کے مرتکب ہوئے ہیں۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ہر حال میں آپ کی اس قدرافزائی اور عزت کا تہ دل سے شکرگزار ہوں۔ کاش میں اس دلی شکر کو الفاظ میں پوری طرح ادا کرسکتا۔

قدرت کی بعض نعمتیں ایسی ہیں کہ ان پر ہماری زندگی کا انحصار ہی، وہ نہ ہوں تو ہماری زندگی کا خاتمہ ہوجائے، جیسے ہوا، پانی تنفس وغیرہ؛ لیکن عام یا بافراط ہونے سے ہمیں ان کی کچھ قدر نہیں ہوتی۔ یہی حال زبان کا ہی۔ بچپن سے لے کر مرتے دم تک یہ ہمارے ساتھ ہی اور روزمرہ کے استعمال کی وجہ سے

وہ ایک معمولی چیز ہوگئی ہے اور ہم اس کی وہ قدر نہیں کرتے جو کرنی چاہیے - ورنہ دیکھا جائے تو زبان کا انسان کی زندگی میں بہت بڑا دخل ہے - اس کے نتائج اور اثرات نہایت عجیب اور دُور رس ہیں - یہ ایک معمولی بات ہے جسے ہر شخص جانتا ہے کہ حیوان اور انسان میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اگرچہ جانوروں کے بھی زبان (جیبھ) ہے اور بعض کی ہم سے بہت بڑی ہوتی ہے لیکن ان میں قوت گویائی نہیں - یہ خاص انسان کی امتیازی شان ہے - یہ محض اس کے خیالات کے اظہار کا آلہ ہی نہیں بلکہ اُن کے خیالات کے بنانے اور سنوارنے کا بھی آلہ ہے - وہ انسان کی زندگی کا جز ہے - اس لیے آدمی کو اپنی زبان عزیز ہوتی ہے - وہ ہماری زندگی کے ہر شعبے میں دخیل اور کار فرما ہے - اگر ہم اس کے تحفظ و ترقی کے لیے جد و جہد کریں، جان لڑادیں تو یہ ہمارا فرض ہے - اور اس فرض سے غفلت کسی مذہب و ملّت میں روا نہیں -

اردو ایک مخلوط زبان ہے - یہ زبان کی ایک خاص قسم ہے - دنیا میں ایسی متعدد زبانیں ہیں - اس قسم کی زبانوں کے وجود میں آنے کے مختلف اسباب ہوتے ہیں - منجملہ دیگر اسباب کے ایک سبب کشور کشائی ہے - مسلمان بھی اس ملک میں آریاؤں کی طرح فاتح کی حیثیت سے آئے تھے وہ فارسی بولتے تھے اور اہل ملک دیسی زبان - ان حالات میں جیسا کہ دستور ہے معاشرتی، ملکی اور کاروباری ضرورت سے مسلمان بول چال میں دیسی لفظ استعمال کرنے کی کوشش کرتے تھے اور ہندو فارسی الفاظ فاتحوں کی تعداد اہل ملک کے مقابلے میں بہت کم تھی اور اس لیے وہ اہل ملک کی زبان سیکھنے پر مجبور تھے - دو چار نسلوں کے بعد ان کی اولاد ملکی زبان بخوبی بولنے لگی - لیکن فاتح قوم کی زبان کا اثر بھی ملکی زبان پر برابر پڑتا رہا - اور اس اختلاط نے ایک گمنام بولی کو جو عوام بلکہ دیہات کی بولی تھی ایک شائستہ اور مستقل زبان کے رتبے تک پہنچا دیا جسے آپ چاہے اردو کہیے یا

ہندستانی ۔

اس اختلاط نے اس میں بڑی قوت پیدا کردی ہی اور دونوں کی (اور ضمناً کسی دوسری زبانوں کی بھی) خوبیوں کو ایک جا جمع کردیا ہی۔ یہی وجہ ہی کہ اس میں شیرینی اور دل نشینی کے ساتھ شان و شکوہ، وسعت کے ساتھ گہرائی، سادگی کے ساتھ پرکاری موجود ہی۔ اور ہر قسم کے خیالات اور جذبات کے ادا کرنے پر قادر ہی۔

جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں (جیسا کہ حال میں مہاتما گاندھی وغیرہ نے فرمایا ہی) کہ یہ زبان مسلمان بادشاہوں نے بنائی اور حکومت کے زور سے پھیلی وہ نہ صرف اس زبان کی تاریخ سے ناواقف ہیں بلکہ اصولِ لسانیات سے بھی ناآشنا ہیں۔ یہ زبان فطرتی اصول پر خود بخود بنی اور حالات و ضروریات نے اسے اور بڑھایا اور پھیلایا۔ مسلمان بادشاہوں نے کبھی اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ ان کی سرکاری اور درباری اور دفتری زبان آخر تک فارسی رہی۔ اس میں شک نہیں کہ دکن کے بعض بادشاہوں نے اس زبان میں نظمیں لکھیں لیکن ان کے دربار اور دفتر کی زبان بھی فارسی تھی اور اگر وہاں کسی زبان کو دخل ہوا بھی تو وہ مقامی زبان تھی نہ کہ اردو یا ہندستانی۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہی یہ محض معاشرتی ضرورتوں کی بدولت وجود میں آئی اور اس کے بنانے میں زیادہ تر حصہ خود اہل ملک یعنی ہندوؤں کا تھا۔ ایک عالم لسانیات کا قول ہی کہ "غیر زبان جو کسی قوم کو سیکھنی پڑتی ہی مخلوط نہیں ہوتی بلکہ اس کی اپنی زبان غیر زبان کے اثر سے مخلوط بن جاتی ہی" یہ قول بالکل صحیح معلوم ہوتا ہی۔ کیونکہ جب کبھی ہم غیر زبان کے سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو اس میں ہماری زبان کا لفظ یا ہماری زبان کا

رنگ نہ آنے پائے ۔ جیسا کہ آج کل انگریزی زبان کا حال ہے۔ جب ہم انگریزی زبان بولتے یا لکھتے ہیں تو اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ حتی الامکان کوئی ہندستانی لفظ نہ آنے پائے اور نہ ہندستانی قسم کی انگریزی ہو، جو "بابو انگلش" کے نام سے بدنام ہے۔ جہاں تک ممکن ہوتا ہے اہل زبان کی تقلید کی جاتی ہے بلکہ انگریزی لب و لہجہ کی نقل اُتارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ برخلاف اس کے اپنی زبان میں گفتگو کرتے وقت ہم بیسیوں انگریزی لفظ بے تکلف بول جاتے ہیں اور لکھتے وقت بھی لکھ جاتے ہیں اور اکثر اوقات ہمارے جملوں کی ساخت انگریزی نما ہوتی ہے۔ بعینہ یہی صورت اس وقت فارسی کے ساتھ پیش آئی۔ اول تو یونہیں فاتح قوم کی زبان کی طرف میلان ہوتا ہے۔ دوسرے دفتر اور دربار سرکار کی زبان ہونے کی وجہ سے اس کا سیکھنا اور پڑھنا ضروری تھا۔ مکاتب اور مدارس میں ہندو مسلمان بچے ساتھ ساتھ فارسی پڑھتے تھے۔ پھر باہمی ربط و ضبط اور میل جول نے اس میں اور اضافہ کر دیا۔ کچھ ضرورت کی مجبوری سے، کچھ اظہار علمیت کے لیے، کچھ بطور فیشن اور محض مشیخت کی خاطر ان ہندوؤں نے بے تکلف فارسی عربی الفاظ اپنی زبان میں داخل کرنے شروع کیے۔ آج عربی فارسی الفاظ کی زیادتی کی جو شکایت ہے تو اس معاملے میں زیادہ تر نہیں تو برابر کے قصوروار ہندو بھی ہیں۔ ظاہر ہے جو زبان وہ دفتروں میں استعمال کرتے، کتابوں میں پڑھتے، اپنی تالیفات میں لکھتے اور بول چال میں بولتے تھے، اس کے الفاظ خود بخود زبانوں پر چڑھ جاتے تھے اور وہ ملکی زبان میں بھی دانستہ و نادانستہ، بالارادہ اور بلا ارادہ داخل ہوتے چلے گئے۔

ان تمام اسباب سے ایک ایسی زبان ظہور میں آئی جو اسی دیس کی تھی اور اسی دیس والوں کی بدولت بنی، بڑھی اور پھیلی۔ اور اس لیے اسے

ملک کی عام زبان ہونے کا حق ہوسکتا ہی کیونکہ یہ ہندو مسلم اتحاد اور ایک جہتی کی عزیز اور مقدس یادگار ہی۔ ایسی صورت میں ایک یونیورسٹی کے ہندی سنسکرت کے لکچرار کا اسے غیر ملکی زبان کہنا یا اردو کے ایک قابل ہندو ادیب کا اسے بین الاقوامی یا سفارتی زبان سے موسوم کرنا سراسر ناانصافی ہی۔

یہ امر خاص مسرت کا باعث ہی کہ تقریبًا ہر صوبہ اس بات کا مدعی ہی کہ اُردو زبان نے وہیں جنم لیا۔ اہل پنجاب کو یہ دعویٰ ہی کہ اُردو کا بیج اُسی خطے میں اُپجا۔ اہل دلی کا خیال ہی کہ یہ دلی اور اس کے قرب وجوار کی زبان تھی جو بن سنور کر اردو کہلائی۔ صوبۂ متحدہ والے کہتے ہیں کہ میرٹھ اور اس کے آس پاس کے دیہات کی بولی پر فارسی کی قلم لگائی گئی اور اس سے اردو پیدا ہوئی یا بقول ایک فریق کے برج بھاشا یا سورسینی بولی سے اسکا ظہور ہوا۔ اہل گجرات کہتے ہیں کہ یہ کچی دھات تھی، ہم نے اسے نکھارا، بنایا اور سنوارا۔ اہل دکن کا دعویٰ ہی کہ اس زبان نے ادبی شان یہاں پیدا کی اور فروغ پایا۔ بہار والے چاہیں تو وہ بھی گجرات و دکن کی طرح اس بات کا دعویٰ کرسکتے ہیں کہ انھوں نے ابتدا سے اس زبان کی غور و پرداخت کی اور وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کا کلام پیش کرسکتے ہیں جس کا تعلق آٹھویں صدی ہجری سے ہی اور جسے ہم اس زمانے کی اردو کہہ سکتے ہیں۔ اس سے اردو کی مقبولیت اور وسعت کا اندازہ ہوسکتا ہی۔ اور قبول عام ہی سب سے قوی دلیل اور سب سے بڑی سند ہی۔ وہ خود رو نونہال جو دوآبۂ گنگ وجمن اور اس کے قرب وجوار میں پھلا پھولا، اقتضائے زمانہ کی ہوا اس کے بیج دور دور تک اُڑا لے گئی، ہر سرزمین کی آب وہوا جہاں وہ پہنچے، انھیں راس آئی اور ہر خطے کی زمین ان کے موافق نکلی۔ انھیں بے حقیقت بیجوں سے لہلہاتے ہوے شاداب

پودے نکلے ۔ قدرت نے ان بیجوں کی حفاظت کی ، کلّے پھوٹنے پر ان کی پرورش کی اور ہمارے اسلاف نے اپنی آبیاری سے ان کی غور و پرداخت فرمائی۔ وہی بے حقیقت بیج اور وہی نازک پودے آج سرسبز تناور درخت ہیں جن کے پھول پھل سے ہمیں اس وقت ذوق تکلم حاصل ہے۔

اس کی مقبولیت کا پتا اس سے بھی چلتا ہے کہ بعض علاقے کے لوگوں نے اس سے اپنی خصوصیت جتانے کے لیے اسے اپنے سے منسوب کر لیا تھا۔ چنانچہ اہل گجرات ایک زمانے میں اسے گجری یا گجراتی کہتے تھے اور اہل دکن دکنی۔ ابتدا میں اسے ہندی کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ یہ اس ملک کی زبان سے نکلی تھی اور اپنے وقت کی کھڑی بولی سے پیدا ہوئی تھی، دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ نام اسے فارسی کے مقابلے میں اور فارسی سے امتیاز کرنے کے لیے دیا گیا تھا جو اس وقت عام طور پر رائج تھی۔ چنانچہ یہ لفظ اس زبان کے لیے قدیم دکنی اور گجراتی اردو میں بھی انھیں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ وہ معذرت کے طور پر اکثر اپنی تصانیف میں یہ لکھتے ہیں کہ جو لوگ فارسی عربی سے بہرہ نہیں رکھتے ان کے لیے ہم نے یہ کتاب ہندی میں لکھی ہے۔ یا یہ کہ یہ کتاب فارسی میں تھی عام لوگوں کی خاطر ہندی میں ترجمہ کی۔ یہ لفظ مصحفی کے زمانے تک انھیں معنوں میں استعمال ہوتا رہا۔ چنانچہ مصحفی اپنے دو تذکروں کو تذکرۂ ہندی یا ہندی گویاں کے ناموں سے یاد کرتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس نے فارسی گو شعرا کا تذکرہ الگ لکھا تھا۔ لیکن یہ نام چل نہ سکا۔ درحقیقت یہ کوئی نام نہ تھا۔ یہ اس وقت استعمال کیا گیا تھا جب کہ وہ کٹھالی میں پڑی گل رہی تھی اور اس نے کوئی خاص حیثیت اور درجہ حاصل نہیں کیا تھا۔ محض فارسی سے امتیاز کرنے کے لیے اسے

ہندی کہہ دیا کرتے تھے۔ دوسرے ہندی کا لفظ بہت عام تھا، کسی خاص زبان کے لیے معین نہیں ہوسکتا تھا۔ بعض فارسی اور یورپی مصنفین نے مرہٹی اور ہندستان کی بعض دوسری زبانوں کو بھی ہندی ہی سے موسوم کیا ہے۔ جب اس بولی کو خود ایک زبان کی حیثیت حاصل ہوگئی اور اس نے زبانی بول چال سے نکل کر ادب میں قدم رکھا تو یہ لفظ خود بخود متروک ہوگیا۔ اس کے ساتھ ساتھ "ریختہ" کا لفظ استعمال ہونے لگا۔ یہ لفظ اس وقت استعمال ہوا جب اس میں ادبی شان پیدا ہوچلی تھی، لیکن زیادہ تر شعر و سخن اور ادبی کلام کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یہ بھی فارسی سے امتیاز پیدا کرنے کے لیے لکھا اور بولا جاتا تھا۔ چنانچہ جن مشاعروں میں صرف اردو کلام پڑھا جاتا تھا انھیں "مراختہ" کہنے لگے۔ یہ اصطلاح صرف چند ہی روز رہی۔ ریختہ کا لفظ بھی کبھی کبھی مرزا غالب کے ابتدائی زمانے تک استعمال ہوتا رہا لیکن جب یہ زبان عام ہوگئی تو یہ لفظ خود بخود خارج ہوگیا۔ سترھویں نیز اٹھارھویں صدی میں پرانے فیشن کے یورپین اور انگریز اسے مورز (Moors) کہتے تھے جس طرح احاطۂ مدراس اور بمبئی کے بعض مقامات میں عوام اسے مسلمانی سے موسوم کرتے ہیں۔ لیکن یہ نام غلط فہمی پر مبنی تھے اور اس لیے اب بالکل متروک ہیں۔ گولکنڈہ کا اردو شاعر اور ادیب وجہی اپنی کتاب "سب رس" میں جو سنہ ۱۰۲۵ھ کی تصنیف ہے اسے "زبان ہندستان" کہتا ہے۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں یورپین اور انگریزی مصنفین کی تحریروں میں ہم اس کا نام "اندوستان"، "اندوستانز"، "ہندوستان"، یا "ہندوستانز" دیکھتے ہیں اور اسی زمانے میں یہ لفظ "ہندستانی" ہوجاتا ہے جو اب تک قائم ہے اور صحیح معنوں پر دلالت کرتا ہے۔

اردو کا لفظ بعد میں آیا۔ میر تقی میر اسے اپنے تذکرے میں "زبان اردوئے معلی شاہجہاں آباد دہلی" لکھتے ہیں۔ اس کے بعد زبان اردو کہنے لگے۔ رفتہ رفتہ زبان کا لفظ اڑ گیا اور خود 'اردو'، زبان کے معنوں میں آنے لگا۔ مصحفی اور انشا کے زمانے میں اس کا رواج عام ہو گیا تھا۔ یہ لفظ اپنی اصل کا پتا دیتا ہے اردو یعنی شاہی کیمپ میں مختلف قوموں اور مختلف زبان کے لوگ تھے اور اور انھیں کے باہمی اختلاط سے یہ مخلوط زبان ظہور میں آئی اور سارے ملک میں پھیل گئی۔ اب اردو اور ہندستانی میں یہ فرق کیا جاتا ہے کہ اردو ادبی زبان ہے اور ہندستانی عام زبان جو خواص و عوام سب سمجھتے ہیں۔ لفظ اردو کی مقبولیت کی ایک وجہ اور بھی ہے کہ یہ لفظ بولنے لکھنے اور پڑھنے میں سہل ترین ہے۔ بولنے میں اس لیے کہ اس میں کوئی ثقیل حرف نہیں اور بلا تکلف زبان سے ادا ہو جاتا ہے۔ پڑھنے میں اس لیے کہ ہر حرف الگ الگ لکھا جاتا ہے۔ لکھنے میں اس لیے کہ چاروں حرف ابجد کے سب سے چھوٹے اور آسان حرف ہیں، کہیں دائرہ یا کشش یا جوڑ نہیں اور لکھنے میں بھی الگ الگ رہتے ہیں۔ اور اس پر طرہ یہ کہ نقطے کا نام نہیں، سب بے نقط ہیں۔"

ہندی اور اردو کا جھگڑا آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے اٹھا تھا۔ لیکن اس زمانے کے مذہبی اور سیاسی اختلافات نے اسے اور چمکا دیا۔ پہلے ایک آدھ جگہ تھا اب سارے ہندستان میں پھیل گیا ہے۔ پہلے ہندی اردو ہی کا قضیہ تھا اب، ہندی، ہندستانی اور اردو کے ساتھ "ہندی ہندستانی" کا ایک نیا شاخسانہ کھڑا کیا گیا ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس نے بہت معقول فیصلہ کیا تھا کہ ملک کی زبان ہندستانی ہے خواہ رسم خط کچھ بھی ہو۔ لیکن تعجب اور افسوس ہے کہ جس مدبرانہ دماغ نے یہ تجویز سوچی تھی اور جنھوں نے اس پر

آمنّا و صدقنّا کہا تھا سب سے پہلے اب وہی اس سے انحراف کر رہے ہیں۔ مہاتما گاندھی کی جدّت پسند طبیعت نے ایک نیا لفظ "ہندی ہندستانی" وضع کرکے گویا جلتی آگ میں تیل ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ جب مہاتما جی سے دریافت کیا گیا کہ اس جدید مُرکّب لفظ سے آپ کی کیا مُراد ہے تو فرمایا کہ "ہندی جو آیندہ چل کر ہندستانی ہوجائے گی" تو یہ زبان نہ ہوئی آیندہ کا پروگرام ہوا۔ قطع نظر اس کے ذرا اس تعریف پر غور کیجیے جو مہاتما گاندھی نے ہندی ہندستانی کی فرمائی ہے یعنی وہ ہندی جو آگے چل کر ہندستانی ہوجائے گی! اس کے یہ معنے ہوئے کہ اس وقت ہم ایسی زبان اختیار کرنی چاہتے ہیں جو سالہا سال تک کئی صدی کی کوشش، جدوجہد اور محنت و مشقت کے بعد ہندستانی ہوجائے گی۔ ہندستانی تو پہلے ہی سے موجود ہے پھر صدیوں تک انتظار کرنے اور سالہا سال کی مصیبت اور کھکھیڑ اُٹھانے سے حاصل؟ جب مدّتوں کی محنت اور مصیبت اور دماغ سوزی کا نتیجہ یہی ہے کہ نئی زبان ہندستانی بن جائے تو ہندستانی جو بنی بنائی رکھی ہے کیوں نہ ابھی اسی کو اختیار کر لیا جائے۔ مہاتما جی کی یہ منطق معمولی سمجھ سے باہر ہے۔ جلسے میں بیٹھ کر رزولیوشن منظور کرالینے یا ووٹوں کے شمار کرالینے سے زبانیں نہیں بنتیں۔

مسٹر کنھیّالال منشی جو بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے روح و رواں اور اس کے جنرل سکرٹری ہیں، انھوں نے حال ہی میں ایک چٹھی ٹائمز آف انڈیا میں لکھی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ "زمانۂ حال کی اکثر زبانیں سنسکرت زبان کے تابع ہیں اور سنسکرت ہی کے زیرِ اثر نشو و نما پا رہی ہیں اور اس لیے سوائے یو۔پی کے اکثر صوبوں میں جو لنگوا فرینکا بن رہی ہے اس کا رجحان زیادہ تر سنسکرت لغات کی طرف ہے"، جس کے صاف معنے یہ ہیں کہ وہ دراوڑی زبانوں سے

قریب ہونے کی خاطر بول چال کی زبان سے دُور ہونا چاہتے ہیں - میں نے جو
بھارتیہ ساہتیہ پرشد میں ہندستانی کی حمایت کی تو اس کی یہ وجہ تھی کہ وہ
بول چال کی زبان ہے - اس میں براہِ راست سنسکرت سے لفظ نہیں آئے بلکہ
پراکرت اور اپھرنش الفاظ لیے گئے ہیں جو اس وقت بول چال میں رائج تھے
اور اب بھی ہیں - مثلاً (جیسا کہ آج کل بعض ہندی ادیبوں نے لکھنا شروع
کیا ہے) اگر ہم سورج کی جگہ سریہ، آنکھ کی جگہ اکشی، پانی کی جگہ جل یا جلم؛
بانو کی جگہ پدیا باروت کی جگہ شام چوں لکھنے لگیں تو اس سے نہ تو زبان میں
کوئی خوبی پیدا ہوتی ہے اور نہ اسلوبِ زبان میں کوئی حسن، بلکہ زبان بگڑتی اور
خراب ہوتی ہے اور دشواری کی وجہ سے عام زبان سے دُور ہوتی چلی جائے گی -
مصنوعی زبانیں کاغذ کی ناویں ہوتی ہیں جو بہت دن نہیں چلتیں - ہم ہندی
آگے بڑھنے کی بجائے ہمیشہ پیچھے ہٹنا جانتے ہیں - زمانۂ گزشتہ کی کچھ اصلی اور
کچھ خیالی چمک ہماری آنکھوں کو ہمیشہ خیرہ کرتی رہتی ہے - اب یہ جھگڑا ہندی اردو
کا نہیں رہا بلکہ ہندستانی سنسکرت کا ہو چلا ہے اور یہ اس سے بھی بُرا ہے -

یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ملک کی موجودہ فضا نے زبان کے مسئلے کو
پیچیدہ اور ناگوار بنا دیا ہے - کسی نے اس کا ناتا مذہب سے جوڑا ہے اور کسی نے
سیاست سے - یہ باتیں ہمیں ایک دوسرے سے دُور کرنے والی ہیں - ہر زبان
کو (خواہ وہ ہندی ہو یا اردو) ترقی کا حق حاصل ہے لیکن کسی کو یہ حق حاصل
نہیں کہ وہ دوسری زبان کی ترقی میں حائل ہو - ہمیں ایک دوسرے کو شبہ کی
نظروں سے نہیں دیکھنا چاہیے اور بجائے بدگمانی پیدا کرنے کے ان بدگمانیوں
کو رفع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جو آج کل کے حالات نے پیدا کر دی ہیں -
ہمیں ایک دوسرے سے قریب ہونے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ آپس کے ملاپ

اور میل جول سے ایک ایسی زبان پیدا ہو جائے جو ہم سب کی مشترک ملک ہو۔
زبان کا کوئی مذہب نہیں اس کی کوئی ذات نہیں۔ جو کوئی اسے بولتا، پڑھتا
لکھتا اور سلیقے سے استعمال کرتا ہے اسی کی زبان ہے خواہ وہ کوئی ہو اور
کہیں کا ہو۔

حضرات!

اس ملک میں ہر چیز ذات بن جاتی ہے، ہمارا ادب بھی ایک زمانے میں
ذات کی حیثیت رکھتا تھا جسے اس کی ذات والے ہی سمجھتے تھے۔ وہ صرف
ایک طبقے میں محدود تھا اور اس سے باہر اس کے سمجھنے والے بہت کم تھے۔
لیکن یہ خوشی کی بات ہے کہ اب میلان سادہ نویسی کی طرف ہو رہا ہے۔ اس میں
سب سے بڑا احسان سر سید احمد خاں مرحوم کا ہے۔ ان کی سلاست اور فصاحت
مانی ہوئی ہے۔ وہ مشکل سے مشکل مضمون کو ایسے صاف اور سیدھے الفاظ اور
دل نشین پیرائے میں ادا کر جاتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ بعد والوں نے اس
خوبی کی قدر نہ کی اور بعض مجبوریوں خصوصاً نئی تعلیم اور نئے خیالات کی
پُرزور رَو کے باعث اور اپنی زبان کی طرف سے غفلت برتنے کے سبب
سے ہم کچھ دنوں کے لیے بہک گئے تھے۔ لیکن شکر کا مقام ہے کہ اب ہم
پھر صحیح رستے پر آرہے ہیں اور رفتہ رفتہ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ادب کا مقصد
کیا ہے اور ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اصل یہ ہے کہ ادب زندگی کا جُز ہے، ہماری
تہذیب اور تمدن کا آئینہ ہے۔ جیسے ہماری زندگی کے حالات ہوں گے ویسا ہی
ہمارا ادب ہوگا۔ دیکھ لیجیے لکھنؤ کا فسانۂ عجائب اور دہلی کا قصۂ چہار درویش۔
دونوں میں دونوں کا تمدن صاف جھلک رہا ہے۔ زبان ہی ایک ایسا ذریعہ
ہے کہ ہم اپنے خیالات دوسرے تک پہنچا سکتے ہیں اور جس قدر زیادہ تعداد

تک ہم اپنے خیالات پہنچا سکتے ہیں اسی قدر ہمارا حلقۂ اثر زیادہ وسیع ہوگا۔
جو شخص اپنا کلام اور پیغام ہزاروں تک پہنچا سکتا ہے وہ اس سے بھی بڑا ہے
اور جو کروڑوں تک پہنچا سکتا ہے وہ سب سے بڑا شخص ہے اور جو تمام بنی نوع
انسان تک اپنا پیغام پہنچا سکتا ہے وہ سب سے بڑا انسان ہے۔ لیکن کلام لاکھوں
کروڑوں انسانوں تک کس صورت میں پہنچ سکتا ہے؟ یہ اسی صورت میں ممکن
ہے کہ الفاظ سادہ اور دل نشین ہوں اور خیالات میں گنجلک نہ ہو۔ دل کی آواز
سادہ ہوتی ہے۔ کلمۂ حق ہمیشہ سادہ ہوتا ہے جس کا جلوہ ہمیشہ سادگی ہی میں
نمایاں اور دلکش ہوتا ہے۔ زبان سیکھو، پڑھو اور لکھو لیکن اس کے ساتھ دل
اور صداقت بھی پیدا کرو۔ جہاں دل میں درد اور صداقت نہیں وہاں آواز
میں بھی درد اور صداقت نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ میرؔ، نظیرؔ اور حالیؔ زیادہ
مقبول ہوئے اور ناسخؔ، ذوقؔ اور مومنؔ کو وہ قبول عام نصیب نہ ہوا۔

سادہ لکھنے کی ہدایت کرنا آسان ہے لیکن سادہ لکھنا نہایت دشوار ہے۔
لوگ اسے معمولی بات سمجھتے ہیں لیکن یہ بہت غیر معمولی چیز ہے۔ یہ بات علاوہ
فطری استعداد کے بڑی مشّاقی، بڑے تجربے، بہت مطالعے اور بہت
مشاہدے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ صرف کامل ادیب ہی اسے نبھا سکتے ہیں۔
سادہ لکھنے کے یہ معنے نہیں ہیں کہ ہم اپنی تحریر میں سادہ اور سہل لفظ جمع
کردیں اور کوئی مشکل لفظ نہ آنے دیں۔ سادگی کے ساتھ جب تک تحریر میں
لُطف، کشش اور اثر نہ ہو وہ ادب میں شمار نہیں ہو سکتی وہ ایک پھیپھسی
بے جان اور بے اثر تحریر کا لکھنا نہ لکھنے سے بدتر ہے۔ جب تک کلام میں
لکھنے والے کی رُوح شریک نہ ہو کلام مُردہ ہوگا اور دلوں میں گھر نہیں کر سکتا۔
اگر آپ کے کلام میں سادگی کے ساتھ صداقت، جِدّت، تازگی اور جوش ہے

تو وہ آبِ رواں کی طرح موجیں مارتا ہؤا بڑھتا ہؤا چلا جائے گا اور اگر وہ دقیق الفاظ، پیچیدہ استعارات و تشبیہات اور تکلّف و تصنع کے بوجھ سے دبا ہؤا ہو تو بحرِ مُردار کے پانی کی طرح ساکن، مُردہ اور بے حس ہوگا۔ زمانۂ حال کے ایک بہت بڑے ادیب نے خوب کہا ہو کہ "سادگی اور صداقت توأم ہیں اور حُسن ان کی تیسری بہن ہو"۔ یہی وہ سادگی ہو جو سیدھی دل و دماغ میں جا بیٹھتی ہو۔ یہی وہ سادگی ہو جو دلوں کو لبھاتی اور گرماتی اور خیالات میں روشنی پیدا کرتی ہو۔ دنیا کے وہ کامل اور اعلیٰ ادیب اور شاعر جن کا سکّہ سارے عالم پر بیٹھا ہؤا ہو ان کے قبولِ عام کا راز اسی میں ہو۔ صدیاں گزر گئیں، جُگ بیت گئے لیکن ان کی مقبولیت میں فرق نہیں آیا۔

حضرات! دنیا کی کوئی زبان نقص سے خالی نہیں۔ بعض زبانیں ہماری زبان سے بھی زیادہ بے قاعدہ، پیچیدہ اور دُشوار ہیں لیکن دشواری کی وجہ سے کوئی اپنی زبان ترک کر کے دوسری زبان اختیار نہیں کر لیتا۔ وہ ہمارے اعضا و قویٰ کی طرح ہماری زندگی کا جُز ہو۔ جس طرح ہم دیدہ و دانستہ اپنے اعضا و قُویٰ کو کاٹ کر نہیں پھینک سکتے اسی طرح ہم اپنی زبان کو بھی اپنے سے جُدا نہیں کر سکتے۔ کچھ مدت ہوئی جاپان میں بہت بڑا بھونچال آیا تھا جس میں ہزارہا جانوں کا نقصان ہؤا لیکن ایسی بیش بہا چیزیں بھی تلف ہوگئیں جو جان سے زیادہ عزیز تھیں۔ جب دِلّی کی ایک بڑی بی نے یہ سنا اور یہ بھی معلوم ہؤا کہ وہاں اکثر زلزلے آتے رہتے ہیں تو بڑی سادگی سے فرماتی ہیں کہ "موئے اس ملک کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے"۔ اسی طرح اگر کوئی آپ سے یہ کہے کہ آپ کی زبان میں فلاں نقص یا بے قاعدگی ہو اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے تو اس کے جواب میں سوائے اس کے کہ آدمی

مسکرا کر چپ ہو رہے اور کیا کہہ سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر زندہ شے کے لیے نشو و نما اور تغیر لازم ہے۔ یہ قانون قدرت ہے۔ لیکن اگر اس قانون کے ساتھ انسانی سعی شریک نہ ہوگی تو بہت جلد وہ ترقی رُک جائے گی۔ نشو و نما کی ترقی کے لیے انسانی سعی بھی لازم ہے۔ جو چیزیں ہمیں بچپن میں بہت عزیز تھیں وہ بڑے ہو کر بے حقیقت معلوم ہوتی ہیں۔ بچپن میں جو کتابیں ہم بڑے شوق سے پڑھتے تھے بڑے ہو کر اُن میں وہ دل کشی نہیں رہتی۔ یہی حال ادب کا ہے۔ زمانۂ گزشتہ کا ادب جو ہمارے اسلاف کی یادگار ہے اور ہمارا قومی سرمایہ ہے اس کا مطالعہ اور تحفّظ ہمارا فرض ہے۔ لیکن اس کا اکثر حصہ ویسا کارگر اور پُراثر نہیں رہا جیسا اُس وقت تھا۔ وہ اُس زمانے کے اقتضا کے مطابق تھا اور اب زمانے کا اقتضا کچھ اور ہے۔ جس طرح عمر کے ساتھ انسان کا ذوق بدلتا رہتا ہے اسی طرح زمانے کا ذوق بھی بدلتا رہتا ہے۔ اس لیے ہمیں صرف اپنے اسلاف کی پونجی ہی پر قانع نہیں رہنا چاہیے بلکہ ہمیں خود بھی اپنے زمانے کے حالات کی رو سے ترقی اور اصلاح میں (جہاں تک زبان کی ساخت اجازت دے) لگاتار اور بے دریغ کوشش کرتے رہنی چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے لیے گزشتہ زمانے میں بہت کچھ ہے لیکن سب کچھ نہیں۔ بے شبہ گزرا ہوا زمانہ قابل احترام ہے لیکن آیندہ زمانہ اس سے بھی زیادہ احترام کے قابل ہے۔ جس شخص کی نظر ہمیشہ پیچھے کی طرف رہتی ہے اور آگے نہیں دیکھتا وہ کبھی دُنیا میں سرسبز نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اصلاح کی طرف سے کبھی غافل نہیں رہنا چاہیے۔ جو چیزیں فرسودہ اور بیکار ہو گئی ہیں ان کے بدلنے اور ترک کرنے میں اور جو کارآمد اور مفید ہیں ان کے اختیار کرنے میں کبھی نہیں چوکنا چاہیے۔

حال ہی میں میرے ایک ذی علم دوست نے مجھ سے پوچھا کہ کیا اردو میں ایسی صلاحیت ہے کہ وہ اعلیٰ ادب پیدا کرسکے ؟ میں نے کہا اردو میں کیا ہر زبان میں یہ صلاحیت موجود ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ان حضرات میں بھی وہ صلاحیت اور شوق صادق ہونا چاہیے جو اسے اعلیٰ ادبی زبان بنانا چاہتے ہیں۔ اردو اب اس درجہ تک پہنچ گئی ہے کہ اگر ہم چاہیں اور ہم میں صلاحیت ہو تو ہم اس میں نازک سے نازک خیال اور ہر فن اور علم کے معلومات کو ادا کرسکتے ہیں۔ اگر ہم نے اسے صرف اس کی قسمت پر یا قدرت کی مہربانی پر چھوڑ دیا تو یہ لہلہاتا ہوا چمن ایک دن جھاڑ جھنکاڑ ہو جائے گا۔ اگر ہم اسے اپنی زبان سمجھتے ہیں، اگر ہم سچائی کے ساتھ اس کی ترقی کے خواہاں ہیں تو کوئی دقیقہ کوئی تکلیف اور محنت اس کے بڑھانے اور بنانے میں اُٹھا نہیں رکھنی چاہیے۔

ایک طرف تو ہمیں اس کی اشاعت میں کوشش کرنی چاہیے کیونکہ جب تک پڑھے لکھوں کی تعداد زیادہ نہ ہوگی اور جب تک زبان کی تعلیم عام نہ ہوگی آپ کا اعلیٰ اور مفید سے مفید ادب بھی بیکار ہوگا اور کیڑوں کی نذر ہو جائے گا۔ دوسری طرف زبان کو مستحکم اور قوی بنانے کی ضرورت ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ اس میں ہر فن اور علم کی کتابیں ہوں، دنیا کی بہترین تصانیف کے ترجمے ہوں، تخلیقی ادب جس کی کمی ہے، پیدا کیا جائے اور ان مصنفوں اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی کی جائے جو اس کام کے اہل ہیں۔ اگر ہم اس کے لیے آمادہ ہیں اور اس کی خاطر تکلیف اٹھانے اور ایثار کرنے کے لیے تیار ہیں تو ہمارا دعویٰ صحیح ہے ورنہ محلوں میں بیٹھ کر خالی دعوے کرنا اور اپنی زبان کو سراہنا اپنے مُنہ میاں مٹھو بننا اور دوسروں کی نظروں میں اپنے آپ کو حقیر بنانا ہے۔

حال ہی میں ایک مؤرخ نے جس نے دنیا کے تمدن پر بہت معقول

کتاب لکھی ہی، مسئلہ تمدن پر بڑی گہری نظر ڈالی ہی اور اس کے تمام پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد آخر میں ساری کتاب کا نچوڑ اس ایک چھوٹے سے جملے میں ادا کر دیا ہی (Man makes himself) یعنے آدمی خود اپنے کو بناتا ہی۔ یہی میں زبان کے متعلق کہتا ہوں کہ اس کا بنانا اور بگاڑنا ہمارے ہاتھ میں ہی۔ ہم جیسا چاہیں گے ویسی بنے گی اور گزشتہ زمانے میں بھی جیسا ہم نے چاہا ویسی بنی۔ لیکن زبان کے بنانے میں یہ نکتہ یاد رکھیے کہ ملک کی عام اور مقبول زبان وہی ہوسکتی ہی جسے زیادہ سے زیادہ تعداد سمجھے۔ اگر آپ اس اصول کو پیش نظر رکھیں گے تو آپ کی زبان سکڑتے سکڑتے ایک محدود حلقے میں بند ہو کے رہ جائے گی۔ ہندستانی یا اردو کو اسی لیے برتری ہی کہ اسے ملک کے زیادہ سے زیادہ اشخاص بولتے یا سمجھتے ہیں۔

حضرات! ہمیں یہ زبان اس لیے عزیز ہی کہ یہ ہماری بول چال کی زبان ہی۔ ہمیں یہ زبان اس لیے عزیز ہی کہ یہ ہندستان کی دو بڑی قوموں کے اتحاد اور یک جہتی کی عزیز یادگار ہی۔ ہمیں یہ اس لیے عزیز ہی کہ یہ ہمارے تمدن، ہماری معاشرت، ہمارے دل و دماغ کے نتائج، ہمارے مادّی اور روحانی خیالات کی حامل ہی۔ ہمیں یہ اس لیے عزیز ہی کہ اس میں ہمارے اسلاف کی صدیوں کی محنت و جانکاہی دماغی و ذہنی کاوشوں کا نچوڑ ہی۔ ہمیں یہ اس لیے عزیز ہی کہ یہ ہمارے بزرگوں کی مقدس وراثت ہی۔ اگر اس پر بھی ہم اس کی قدر نہ کریں اور اس کے بنانے سنوارنے اور بڑھانے میں اپنی پوری ہمت صرف نہ کردیں اور اس کی ترقی و نشو و نما میں جان نہ لڑا دیں تو ہم سے بڑھ کر کوئی ناخلف نہ ہوگا۔

خطبۂ صدارت اُردو کانفرنس

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ضمن میں علی گڑھ میں ایک اُردو کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے مولانا عبدالحق صاحب نے ۲۸ر اپریل ۱۹۳۷ء کی شب کو ذیل کا خطبہ پڑھا تھا۔

مرتّب

گری زوں سوِستان کا ایک پرگنہ ہے اور پہاڑی علاقہ ہے، اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہاں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں، ان کے ہاں قدیم سے ایک روایت مشہور چلی آرہی ہے کہ خلّاق عالم نے فرشتہ کلمائیل کو بیجوں بھرے تھیلے دیے اور فرمایا کہ جاؤ تم دُنیا کا ایک چکّر لگاؤ اور زبانوں کے یہ بیج لوگوں کے سروں میں بوتے چلے جاؤ۔ فرشتے نے ارشاد خداوندی کی تعمیل کی اور یہ بیج بنی نوع انسان کے دماغوں میں جم گئے اور فوراً اُگنے شروع ہوئے اور زبانیں چشمے کی طرح اُبلنے لگیں۔ جب فرشتہ کلمائیل اپنے تھیلے خالی کرچکا اور خلّاق عالم کے پاس واپس آنے کو ہوا تو یہ دیکھ کر اسے سخت ندامت اور پریشانی ہوئی کہ گری زوں کا علاقہ چھٹ گیا ہے۔ اس نے خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں اس فروگزاشت کے متعلق عرض کیا۔ خدا نے مختلف تھیلوں کے ملے جُلے بیج جو بچ رہے تھے اسے دیے اور کہا کہ جاؤ، یہ وہاں جاکر بو آؤ۔ یہی

وجہ ہی کہ اس پہاڑی آبادی میں طرح طرح کی زبانیں اور بولیاں پائی جاتی ہیں۔
یہ نقل بہ نسبت گری زوں کے ہندستان پر زیادہ صادق آتی ہی جہاں
بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں جن کی تعداد بیسیوں نہیں سینکڑوں تک
پہنچ گئی ہی۔ لیکن اس ہجوم میں ایک زبان ایسی بھی نظر آتی ہی جو ملک کے اکثر
علاقوں میں بولی جاتی ہی اور تقریباً ہر جگہ سمجھی جاتی ہی۔ یہ زبان ہندستانی یا اردو
ہی جس کا ادب نظم و نثر میں نویں صدی ہجری سے مسلسل موجود ہی۔ یہ ہمارا ہی
دعویٰ نہیں بلکہ اس کی شہادت غیروں نے بھی دی ہی اور یہ شہادتیں یوروپی
سیاحوں کی تحریروں میں سترھویں صدی کی ابتدا سے بعد تک برابر ملتی ہیں۔
ایک موقع پر کسی خاص معاملے میں ابی سینیا کے سفیر خوجہ (Movaad) سے
چند استفسارات کیے گئے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ "فلاں شخص نے
آپ کی حضوری میں کس زبان میں گفتگو کی" وہ جواب دیتے ہیں۔ "ہندستانی
زبان میں۔ جس کی ترجمانی ڈیر اکسیلنسیز دی ہائی گورنمنٹ آف بٹاویا کے سیکرٹری
نے کی"۔ یہ واقعہ سنہ ۱۶۹۷ء کا ہی۔ اس زمانے کا ایک سیاح لکھتا ہی کہ "دربار کی
زبان تو فارسی ہی مگر عام بول چال کی زبان "اندستان" ہی" (فرائر)

یہ اگلی باتیں ہیں، انھیں جانے دیجیے۔ کمپنی کے زمانے کو لیجیے۔ جب
ایسٹ انڈیا نے اپنا کاروبار یہاں جمایا اور تجارت سے سیاست کی طرف قدم
بڑھایا تو تجارت اور سیاست دونوں اغراض کی خاطر تازہ ولائت نوکار انگریز
ملازموں کی تعلیم کے لیے ملک کی ایک ایسی زبان کا انتخاب کیا جو اپنی عام
مقبولیت اور وسعت کی وجہ سے سب سے زیادہ کارآمد تھی۔ یہ زبان ہندستانی
یعنی "اردو" تھی۔ اس کے لیے ایک بڑا مدرسہ قائم کیا گیا جو فورٹ ولیم کالج
کے نام سے مشہور رہی۔ اس میں قابل زباں دان ہندی ملازم رکھے گئے جو نوجوان

نوواردوں کو ہندستانی زبان کی تعلیم بھی دیتے تھے اور کتابیں بھی تالیف اور ترجمہ کرتے تھے۔ اس کالج کے معلم اول ڈاکٹر جان گلکرسٹ جو اردو کے محسن اور اس کے شیدائیوں میں سے تھے اس زبان کو (Grand Popular Speech of India)[1] کہتے ہیں۔ ایک دوسری جگہ وہ اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ "یہ نہایت کارآمد اور عام زبان ہے جس پر ہندستان فخر کرسکتا ہے"۔ وہ اپنی اسی کتاب برٹش انڈیا مونی ٹر میں لکھتے ہیں کہ "چونکہ ہندستانی، ہندستان کی سب سے زیادہ عام زبان ہے اور جو ہمیں شب و روز اپنے دیسی افسروں، مدرسوں، ملازموں اور دیگر متعلقین سے گفتگو کرنے میں استعمال کرنی پڑتی ہے اس لیے نحوی اصول کے ساتھ اسے جس قدر جلد سیکھا جائے اسی قدر بہتر ہے[2]"۔

اس زبان کی تعلیم کے متعلق گورنمنٹ کے احکام نقل کرنے کے بعد وہ ان برٹش افسروں اور دیگر اصحاب کے نام ایک پیام بھیجتا ہے جو ہندستان آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ پیام یہ ہے:-

> "جب سے متذکرہ بالا احکام نافذ ہوئے ہیں بنگال گورنمنٹ نے بنگال، مدراس اور بمبئی کے ملکی اور فوجی علاقوں کے لیے مشرقی تعلیم کا باقاعدہ انتظام کیا ہے، ان سب میں ہندستانی بجا طور پر مقدم اور اہم خیال کی گئی ہے اور اس لیے تمام رائٹروں اور کیڈٹوں کو ہندستان پہنچنے پر سکھائی جاتی ہے۔
> ہندستانی زبان کا علم برٹش انڈیا میں نہ صرف ہر ایک ایسے

British India Monitor Preface, X civ. [1][2]

اجنبی کے لیے لازم ولابد ہی جو عام طور پر اہل ملک سے ذاتی تعلقات رکھتا ہی بلکہ اس سے فارسی اور دوسری مشرقی زبانوں کی تحصیل کا رستہ بھی کھل جاتا ہی جہاں وہ ہندستانی کے ذریعے سے جو ہندستان کے باشندوں اور خصوصًا منشیوں یا دیسی سوداگروں کی دیسی زبان ہی، ان مقامی قدیم زبانوں کو بہت جلد سیکھ لیتا ہی۔

بحری اور برّی فوج میں نیز ہندستان کے خانگی معاملات میں کسی زبان کا ایسا عام رواج نہیں جیسا ہندستانی کا ہی اور کیڈٹوں کو جو فوجی اکیڈیمیوں میں اسے پڑھتے ہیں یا فوجی تعلیم حاصل کرتے ہیں کسی اور زبان کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ اکیڈیمیاں بنگال، مدراس اور بمبئی میں قائم کی گئی ہیں۔

جس طرح یورپ میں ایک تعلیم یافتہ شخص کے لیے بعض جدید اور قدیم زبانوں کا علم مفید اور موجب زینت سمجھا جاتا ہی اسی طرح ہندستان میں سنسکرت فارسی، عربی وغیرہ کا علم بھی وہی درجہ رکھتا ہی۔ لیکن یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں ہر شخص کے لیے ہندستانی کا جاننا ایسا ہی ناگزیر ہی جیسا کہ انگلستان والوں کے لیے انگریزی کا جاننا اور اسی لیے ان حضرات کا جو ایسٹ انڈیز کو آنا چاہتے ہیں سب سے ضروری اور بڑا وصف یہی ہونا چاہیے کیونکہ دیر سویر ان پر صاف کھل جائے گا کہ ہندستانی کے مقابلے میں یہ علمی زبانیں دوسرے درجے پر ہیں اور بعد میں یہ زبانیں اس ملک میں زیادہ آسانی اور کم خرچ میں سیکھی جاسکتی ہیں۔

اگر یہ دلیل انگلستان و بیرون انگلستان کے چندسالہ تجربے
کی بنا پر معروف و مسلّم واقعات پر مبنی ہی تو پبلک بجا طور پر یہ
امید رکھتی ہی کہ "ہر فورڈ" اور "مارلو" کے سول اور ملٹری
کالجوں کے شعبوں میں ہندستانی زبان کی تعلیم اُن طلبہ کے لیے
جو ہندستان آنا چاہتے ہیں، سب سے مقدّم خیال کی جائے گی
کیونکہ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ہمارے انگلستان کے جج اور سول
اور ملٹری کے عہدہ دار خود وہ کیسے ہی عالم و فاضل کیوں نہ ہوں
وہ ہمارے ملک میں اپنے عہدوں کے بالکل نا اہل ثابت ہوں گے
اگر وہ ہماری مادری زبان نہیں جانتے۔ اسی طرح ہندستان میں
ہندستانی کا وہی درجہ ہی جو انگریزی کا برطانیہ میں یا ترکی کا اس کی
سلطنت میں اور یہ ایک ایسی بات ہی جو راہ چلتا بھی سمجھ سکتا ہی"

ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب میں مدراس کے ایک انگریز افسر کا خط
بھی نقل کیا ہی جس میں مفصلۂ ذیل اقتباس پڑھنے کے قابل ہی۔

(خط ۱۹ر جون سنہ ۱۸۰۲ء کا لکھا ہوا ہی)

ہندستانی بولی کے متعلق میرا کچھ کہنا غیر ضروری ہی کیونکہ اس کی
وسعت اور قوت ان تمام اشخاص پر کافی طور سے آشکارا ہی جن کا
تعلق ہندستان کے کار و بار یا ادب سے ہی، میری رائے میں
صرف اس بولی کا معقول علم اس گورنمنٹ کے علاقوں کے
ہر حصے کے لیے بالکل کافی ہی...... نواب آف ارکاٹ کے
تمام علاقوں اور ٹیپو سلطان کی مملکت بالاگھاٹ میں ہندستانی
سے وہ سب اشخاص واقف ہیں جو سرکاری دفاتر میں مامور ہیں،

نیز عام لوگوں کی بڑی تعداد اس زبان کو جانتی ہے"۔

ڈاکٹر صاحب اپنی ایک اور تصنیف "ایسٹ انڈیا گائڈ" میں تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"اگرچہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہندستان کے مختلف اضلاع اور صوبوں میں خاص خاص بولیاں بولی جاتی ہیں لیکن ہم جرأت کے ساتھ یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ اگر فرداً فرداً دیکھا جائے تو ان میں کوئی بھی عام طور پر ایسی مفید اور ضروری نہیں جیسی ہندستانی .....

"اب ہم اس دعوے کی تائید میں چند دلائل پیش کرتے ہیں جو بلا شبہ اس کی صداقت کا تشفی بخش اور دلنشین ثبوت ہوں گی۔

"ہندستان کے وسیع ملک میں شاید ہی کوئی ایسا مسلمان پایا جائے گا جو مقامی اور ذاتی حالات یعنے خاندانی و تعلیمی وغیرہ کے لحاظ سے کم و بیش شستگی اور خوبی سے ہندستانی زبان نہیں بولتا یا نہیں سمجھتا۔ نیز ہر شریف ہندو یا وہ جس کا ذرا سا بھی تعلق کسی مسلمان حکومت یا برٹش گورنمنٹ سے ہے اپنے منصب اور حیثیت کے لحاظ سے ضرور اس زبان سے کچھ نہ کچھ واقف ہے۔

"علاوہ اس کے یہ ایک مشترک ذریعہ ہے جس کے توسط سے اہل ملک عموماً اور متعدد غیر ملکوں کے اکثر باشندے جو اس ملک میں بس گئے ہیں اپنی ضرورتوں اور خیالات کا ایک دوسرے پر اظہار کرتے ہیں۔ اس بیان کی صداقت کی تائید میں ہم خود ایک شہادت ہیں اور ہماری طرح پرتگالی، ولندیزی (ڈچ)، فرانسیسی، ڈین، عرب، ترک، یونانی (گریگ) ارمنی، گرجی، ایرانی، مغل اور چینی بھی ہیں جو اکثر باہم ہندستانی میں بات چیت کرتے ہیں، کیونکہ ان کی اپنی زبانوں کے مقابلے میں ہندستان کی یہ لنگوا فرینکا زیادہ

سہولت بخش ہی - ہندستان کی تمام فوجوں میں یہ زبان عام طور پر استعمال ہوتی ہی اگرچہ ان افواج کے اکثر افراد اپنی اپنی حکومتوں، علاقوں، صوبوں اور اضلاع کی بولیوں کو مادری زبان کی حیثیت سے زیادہ بہتر جانتے ہیں -

"تقریباً کیپ کامورن سے لے کر کابل تک سارا ملک جو طول میں دو ہزار میل اور عرض میں ۱۴۰۰ میل ہی اس میں جہاں جہاں گنگا بہتی ہی شاید ہی کسی بڑے گانو، قصبے یا شہر میں جسے مسلمانوں نے فتح کیا یا جہاں مسلمان آباد ہیں کوئی ایسا شخص ملے گا جو اچھی خاصی طرح ہندستانی نہ جانتا ہو- اور گنگا سے بھی بہت پرے، نیز مشرقی جزائر کے سواحل پر بھی یہ زبان رائج ہی اور اس قدر معروف ہی کہ بہت آسانی سے سمجھی جاسکتی ہی-

"اگرچہ ہندستانی میں نثر کی بہت سی کتابیں مثلاً تاریخی یا علمی تالیفات نہیں ہیں تاہم بہت سے شستہ قصّے اور دلکش نظمیں موجود ہیں- عام طور پر خانگی، تجارتی اور فوجی اور نہایت اہم سیاسی معاملات کے متعلق مراسلت اسی زبان میں کی جاتی ہی- اور اس موقع پر ہمیں اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ دینی علما کا درس اور مضامین ادب پر ان کی تمام بحثیں اور دلائل اسی زبان میں کی جاتی ہیں اور ہر حالت میں یہ دیکھا گیا ہی کہ جب کبھی ہندستان کا کوئی باشندہ اپنے کسی خیال یا مضمون کو کسی دوسری زبان میں لکھنا یا ترجمہ کرنا چاہتا ہی تو قبل اس کے کہ وہ اسے فارسی مکتوب کے طور پر لکھے یا کوئی سیاسی تحریر قلم بند کرے وہ ہمیشہ اپنے خیالات کو ہندستانی میں ترتیب دیتا ہی اور اپنا مفہوم اسی زبان میں ادا کرتا ہی-

"اگر یہ تمام بیانات اور دلائل صداقت پر مبنی ہیں تو ان کی قوت کو کون چیز کمزور کرسکتی ہی- اوُپر کے صغریٰ کبریٰ سے یہ نتیجہ نکلتا ہی کہ سوداگر، سیّاح،

وکیل، مُلّا یا پادری، فلسفی، طبیب، غرض ہر شخص کے لیے جو ہندستان میں کسی قسم کا بھی کوئی کام کر رہا ہو یا یہاں امن و خوشی سے رہنا چاہتا ہو ہندستانی زبان بہ نسبت کسی دوسری زبان کے عموماً نہایت ضروری اور مفید ہو۔ اور اس اعتبار سے سب سے مقدم اسی کا سیکھنا ہو اور اس کے بعد بوجہ ان اعلیٰ فوائد کے جو اسے باقی دوسری زبانوں کے مقابلے میں بدرجۂ اتم حاصل ہیں یہ نہایت درجہ قابل قدر اور لایق مطالعہ ہو۔"

کول بروک جو بڑے عالم گزرے ہیں، ایشیاٹک ری سرچز کی ساتویں جلد میں لکھتے ہیں کہ یہ شستہ زبان جو ہندستان اور دکن کے ہر حصے میں بولی جاتی ہو یا جو تعلیم یافتہ دیسیوں نیز ہندستان کے بہت سے صوبوں کے ناخواندہ لوگوں میں باہمی گفتگو کا مشترک ذریعہ ہو اور جسے تقریباً ہر جگہ نیز ہر گاؤں کے اکثر باشندے سمجھتے ہیں۔"

ڈاکٹر گلکرسٹ نے اپنے ایک شاگردِ رشید کا خط نقل کیا ہو جو بہت دلچسپ اور حقیقت افروز ہو۔ اس کے کاتب مشہور مسٹر مٹکاف ہیں جو اُس وقت دِلّی کے اسسٹنٹ رزیڈنٹ تھے اور بعد میں رزیڈنٹ کیا دلّی کے آقا ہوگئے تھے۔ یہ خط ۲۹ راگست سنہ ۱۸۰۶ء کا لکھا ہوا ہو۔ اس سے معلوم ہوگا کہ اُس زمانے میں اُردو کی کیا حیثیت اور وقعت تھی۔ وہ لکھتے ہیں۔

"میرا خیال ہو کہ میں آپ کو اس معاملے کے بارے میں قابل اطمینان اطلاع مہیّا کر سکتا ہوں جس کے متعلق آپ کو قدرتی طور پر تشویش ہو۔

"ہندستان کے ہر حصے میں جہاں جہاں میں ملازمت کے سلسلے میں رہا، یعنے کلکتے سے لاہور کے قرب وجوار تک اور کوہستان کمائیوں سے نربدا تک، افغانوں، راجپوتوں، جاٹوں سکھوں، اور مختلف اقوام میں جو ان

جو ان ممالک میں آباد ہیں، جن میں میں نے سفر کیا ہی، میں نے اس زبان کا
عام رواج دیکھا جس کی تعلیم آپ نے مجھے دی تھی۔ یوں کہنے کو بہت سی بولیاں
اور لہجے ہیں۔ اپنی بات سمجھانے یا دوسرے کی سمجھنے کے لیے اکثر بہت صبر کی
ضرورت ہوتی ہی، ہمارے کان ہمیشہ ان آوازوں سے آشنا نہیں ہوتے جو
ہم سُنتے ہیں۔ اول اول دیسی لوگ ہمارے لہجے اور ڈھنگ کو بغیر بار بار
دُہرائے نہیں سمجھتے۔ یہ دقت اکثر مقامات پر واقع ہوتی ہی۔ لیکن میں ذاتی
تجربے نیز اطلاعات کی بنا پر جو مجھے دوسروں سے حاصل ہوئی ہیں پورے
یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں کیپ کامرون سے کشمیر تک اور آوا
سے دریائے سندھ کے دہانے تک پیدل چلا جاؤں تو مجھے ہر جگہ ایسے لوگ
ملیں گے جو ہندستانی بول سکتے ہیں۔ میرے کہنے کا یہ منشا نہیں کہ میں ایسے
لوگ مطلق نہ پاؤں گا جو یہ زبان نہیں بول سکتے، کیونکہ یہ ظاہر ہی کہ اس وسیع
خطے میں جس کا میں نے ذکر کیا ہی مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ بلکہ ایسا نہ ہو
تو تعجب ہی۔ لیکن ہندستانی ہی وہ زبان ہی جو عام طور پر کار آمد ہی اور میری
رائے میں اسے وہ عام وسعت حاصل ہی جو دنیا کی کسی زبان کو نصیب نہیں۔
میں ابھی اس زبان میں کچا ہوں لیکن جس قدر میرا جہل زیادہ ہی اسی قدر
میری شہادت قوی ہی اور جہاں تک میری شہادت کا تعلق ہی ہندستانی کا
بول بالا رہے گا۔ میرے خیال میں دُنیا خاص طور پر آپ کی رہین منت ہی
اور اسے آپ کی ان پُر جوش اور مخلصانہ کوششوں کے لیے آپ کا شکرگزار
ہونا چاہیے جو آپ نے مشرقی ادب کی اس نہایت اہم شاخ کی اشاعت
و ترقی میں فرمائی ہیں۔

زباں دانِ اُردو ہی ایسا کہ آج   ہی قانونِ ہندی کو اس سے رواج"

میں نے جو کسی قدر طویل اقتباسات پڑھ کر سنائے ہیں اس سے میرا منشا یہ جتانا تھا کہ اردو زبان خاص کر اٹھارھویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کی ابتدا میں اپنی مقبولیت اور عالم گیری میں سب پر سبقت لے گئی تھی اور یہ رفتار اس کی برابر جاری رہی۔ چنانچہ موسیو دیوپان نے جو انسٹیٹیوٹ کے رکن اور سینٹ کے ممبر اور فاضل شخص تھے اپنی کتاب "اقوام کی پیدائش قوت ہیں" ایک باب ہندستانیوں کے متعلق لکھا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ برطانوی ہند کی مردم شماری سرکاری کاغذات کے مطابق اس وقت ۲۸ کروڑ ۴۰ لاکھ ہے۔ آپ کو معلوم رہنا چاہیے کہ ان میں تقریباً ۲۰ کروڑ نفوس کے درمیان جو چیز ایک مشترک رشتے کا کام دیتی ہے وہ اردو زبان ہے، یہ زبان پورے یورپ کے برابر رقبے کی سرزمین میں بولی جاتی ہے*۔

گارساں دتاسی جو اردو زبان کے پروفیسر اور عالم اور اس کے بڑے حامی تھے اور جنھوں نے اپنے زمانے میں اردو کی یادگار خدمت کی اور ایسی عمدہ کتابیں لکھیں اور زبان کے متعلق ایسی قابل قدر معلومات مہیا کیں جو کوئی اہلِ زبان بھی اپنی زبان میں نہ کر سکا، سنہ ۱۸۶۵ء کے خطبے میں کہتے ہیں۔

"بہرنہج لوگوں کا خیال ہندستانی کی نسبت کچھ ہی ہو لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ سارے ہندستان کی مشترک زبان بن گئی ہے، دن بدن جو اس کی ترقی ہو رہی ہے اس کی وجہ سے وہ پورے دیس کی زبان کہی جا سکتی ہے، اس مسئلے کی نسبت کپتان ایچ۔ مور نے جو مرکزی حکومت میں ترجمان کی خدمت پر فائز ہیں اپنی رائے سے مجھے ان الفاظ میں مطلع کیا ہے "بلاشبہ کچھ عرصے کے بعد ہندستانی مشرق کی ایک نہایت اہم زبان کی حیثیت اختیار

---

* خطبات گارساں دتاسی صفحہ ۳۶۵۔

کرلے گی۔ اس زبان کے توسط سے لاکھوں اہل مشرق تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ ریل کی وجہ سے جو اندرون ملک میں ہزارہا میل کی مسافت میں پھیل گئی ہو، ہندستان اور وسط ایشیا کے لوگوں کو اور بھی ملنے جلنے کا موقع ملا ہو۔ چنانچہ جب یہ لوگ ملتے ہیں تو ایک مشترک زبان کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ہندستانی زبان اس مقصد کو بطریق احسن پورا کرتی ہو اس لیے کہ اس کی ساخت میں ہندی فارسی، عربی کے عنصر شامل ہیں۔ اس زبان میں بدرجۂ اتم یہ صلاحیت پائی جاتی ہو کہ ہندو اور مسلمان دونوں کے مقاصد پورا کرے۔ میرے خیال میں ہندستان کے قدرتی وسائل کی ترقی کے جس قدر امکانات ہیں اسی قدر ہندستانی زبان کو فروغ حاصل کرنے کے مواقع موجود ہیں[۹۴]۔"

یہ وہ زمانہ ہو کہ اردو مقبول خاص و عام تھی اور اس کی مقبولیت کا ناقابل تردید ثبوت یہ ہو کہ سنہ ۱۸۳۵ء کے بعد جب فارسی کے بجائے اردو دفتری زبان قرار دی گئی تو کوئی آواز اس کے خلاف سننے میں نہیں آئی اور کسی نے یہ نہ کہا کہ اردو نہیں، فلاں زبان ہونی چاہیے۔ اس کی یہ متفقہ مقبولیت ایک مدت تک برابر جاری رہی، چنانچہ گارساں دتاسی، بمبئی گزٹ مورخہ ۲۶ فروری سنہ ۶۱ء کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ بنگال، بہار اور اڑیسہ کے زمینداروں اور دوسرے باشندوں نے وائسرائے گورنر جنرل بہادر کو ایک عرض داشت بھیجی جس میں یہ درخواست کی کہ جدید ہائی کورٹ میں کارروائی اردو زبان میں ہونی چاہیے۔ اس زمانے میں بمبئی کی نئی نئی یونیورسٹی قائم ہوئی تھی۔ سنہ ۱۸۶۰ء کے ڈگری کے امتحان میں اردو زبان بھی تھی اور اس کے نصاب میں باغ و بہار، اخلاق ہندی، مثنوی میر حسن اور دیوان ناسخ شریک تھے[۹۵]۔

---

[۹۴] خطبات گارساں دتاسی صفحہ ۵۸۴ سنہ ۱۸۶۵ء [۹۵] خطبات گارساں دتاسی صفحہ ۳۲۴۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ ان صوبوں کے ہندو تعلیم یافتہ اور اہل قلم جہاں کی زبان اردو نہ تھی نیز انگریز مدبّر اور حاکم تک عام جلسوں میں اردو میں تقریریں کرتے تھے۔ چنانچہ سنہ ۱۸۶۱ء میں مہاراجہ کشمیر کی گدی نشینی کے موقع پر جموں میں جو دربار ہوا اس میں مسٹر ڈیوس جو اس موقع پر گورنمنٹ ہند کے نمائندہ تھے جب نئے راجا کے سینے پر تمغہ لگا چکے تو مہاراجا نے ان کی تقریر کا جواب اردو میں دیا۔

سر جے۔ بی۔ گرانٹ، لفٹننٹ گورنر بنگال جب یورپ واپس جا رہے تھے تو اہل کلکتہ نے ۱۶۔اپریل سنہ ۱۸۶۱ء کو ان کے اعزاز میں ایک عام جلسہ منعقد کیا۔ اس جلسے کے صدر راودھا کانت دیو بہادر تھے۔ انھوں نے اس موقع پر اردو میں تقریر کی۔ ان کے بعد راجا کالی کشن بہادر نے جو مشہور مصنف گزرے ہیں تقریر کی اور وہ بھی اردو میں تھی۔ نیز ایک جلسے میں سر جان گرانٹ کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کرنے کی تحریک ہوئی جو متفقہ طور پر منظور کی گئی۔ اس جلسے میں راجا اپروا کرشن نے اردو میں تقریر کی اور یہ تجویز پیش کی کہ کلکتہ میں سر جان گرانٹ کا بُت نصب کیا جائے۔ اسی طرح کلکتے کے ایک اور جلسے میں جو اس غرض سے منعقد کیا گیا تھا کہ انگلستان کے کپڑے کے کارخانوں کے مزدوروں سے اظہار ہمدردی کیا جائے، مختلف مقرروں نے ہندستانی میں تقریریں کی اور راجا نرائن سنگھ نے اس جلسے میں تجاویز کی تائید اردو میں کی*۔ شاہزادہ ویلز کی شادی کے موقع پر ہندستان میں ہر جگہ جلسے منعقد ہوئے اور ان میں ہندستانی زبان میں تقریریں کی گئیں۔ فروری سنہ ۱۸۶۲ میں جب سر ہنری منٹگمری لفٹننٹ گورنر پنجاب ریاست کپورتھلہ تشریف لے گئے تو اس موقع پر صاحب موصوف نے مشن اسکول کے طلبہ کے

---

* خطبات گارساں دتاسی صفحہ ۳۷۱۔

سامنے ہندستانی میں تقریر کی۔ جنوری سنہ ۱۸۶۴ء میں پنجاب کے لفٹننٹ گورنر نے اپنی روانگی سے قبل ایک دربار منعقد کیا جس میں مختلف ہندستانی راجا، امرا اور سرکاری عہدہ دار شریک تھے، لفٹننٹ گورنر نے اس موقع پر انگریزی میں نہیں، اردو میں جلسے کو خطاب کیا۔

جب سرجانس لارنس وائسرائے کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے تو انھوں نے ایک بڑا شاندار دربار آگرے میں منعقد کیا جب وائسرائے تخت پر بیٹھنے کے لیے تشریف فرما ہوئے تو توپوں کی سلامی دی گئی اور سر ولیم میور نے شاہی فرمان کا ترجمہ پڑھا اور خود وائسرائے نے حاضرین کے رؤبرؤ ہندستانی میں تقریر کی، برٹش انڈیا ایسوسی ایشن مراد آباد میں لفٹننٹ گورنر نے اردو میں تقریر کی۔ نیز مدرسۂ مراد آباد کے افتتاح کے موقع پر بھی صاحب موصوف نے اردو ہی میں جلسے سے خطاب کیا۔ مہاراجہ بنارس نے سنہ ۱۸۶۸ء میں چیمبرز انسائیکلوپیڈیا کے اردو ترجمے کے لیے دس ہزار روپے منظور کیے بشرطیکہ حکومت بھی دس ہزار دے۔

اب یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اردو کی مقبولیت کے کیا اسباب ہیں، دوسرے ہندی اور اردو کے اختلاف کا مسئلہ کیونکر پیدا ہوا۔ میں پہلے دوسرے سوال کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ بعض اصحاب کا جو یہ خیال ہے کہ سر سید احمد خاں نے نیشنل کانگریس سے مخالفت کر کے ہندی اردو کا اختلاف پیدا کیا، سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ یہ فساد سب سے اول سنہ ۱۸۶۷ء میں بنارس سے اٹھا جہاں کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں اردو زبان اور فارسی خط موقوف کرانے کی کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان

جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔"

ہندوؤں کی اس قومی مجلس میں جو اس وقت بابو فتح نرائن سنگھ کے مکان پر بنارس میں قایم تھی، اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ جابجا اس کے لیے کمیٹیاں، مجلسیں اور سبھائیں مختلف ناموں سے قائم ہوگئیں اور ایک صدر مجلس الہ آباد میں قایم کی گئی جس کے ماتحت تمام مذکورۂ بالا مجلسیں اور سبھائیں تھیں[۱]"۔ اس کے بعد سے یہ جھگڑا مختلف صورتوں میں طرح طرح سے اب تک چلا آرہا ہے جس کی تاریخ اور تفصیل کا یہ موقع نہیں، میں یہاں صرف مختصر طور پر اس کے اصل وجوہ پر غور کرنا چاہتا ہوں۔

پہلے زمانے میں آج کل کی طرح زبان سیاست کے دنگل میں نہیں اُتری تھی۔ لوگ جس زبان میں زیادہ سہولت دیکھتے یا جس زبان میں اشاعت کا زیادہ سامان پاتے اس میں لکھتے تھے اور اکثر اہل قلم اپنی زبان ترک کر دیتے اور غیر زبان میں لکھنا پسند کرتے تھے۔ ایک زمانے میں لاطینی سارے یورپ پر چھائی ہوئی تھی اور بعض جرمن اور انگریز مصنفین لاطینی میں تالیف اور تصنیف کرتے تھے۔ اس میں کسی حکومت کا دباؤ نہ تھا بلکہ اپنے شوق سے کرتے تھے اور انھیں کبھی اس کا گمان تک نہ ہوتا تھا کہ ایسا کرنا قومیت یا وطنیت کے حق میں غدّاری ہے۔ فریڈرک اعظم اگرچہ کٹر جرمن تھا لیکن فرانسیسی بولنے اور لکھنے کو ترجیح دیتا تھا اور فرانسیسی لکھتے یا بولتے وقت اس کے خیال میں بھی کبھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ وہ کسی ایسے فعل کا ارتکاب کر رہا ہے جو اس کے جذبۂ قومیت کے منافی ہے۔ یا ہمارے ملک کی مثال لیجیے۔ جب انگریزی تعلیم کا رواج ہوا تو ہمارے ہم وطن تعلیم یافتہ اکثر انگریزی میں بات چیت اور خط و کتابت کرتے تھے

---

[۱] حیات جاوید صفحہ ۱۴۰۔

اوراب بھی کرتے ہیں، اگرچہ پہلا سا خبط اب نہیں رہا۔ اورجنھیں توفیق ہوتی ہے انگریزی میں تصنیف تالیف بھی کرتے ہیں۔ انگریزی حکومت کا کوئی قانون ایسا نہیں کہ سوائے انگریزی کے کسی دیسی یا دوسری زبان میں تالیف نہ کی جائے۔ لوگ یہ سب کچھ اپنے شوق سے کرتے ہیں۔ بعینہٖ یہی حال مغلوں کی حکومت میں تھا جب کہ یہاں فارسی کا رواج ہوُا۔ مغلوں کی حکومت میں ہندستان کی کایا بدل گئی۔ وہ اس ملک میں اپنے ساتھ نئے آئین اور نئے اصول حکومت اور نیا مذہب لائے، انھوں نے نئی تنظیم اورنئی حکمت کو رواج دیا اور نئے تمدن اور نئی تہذیب اور نئی معاشرت کا دور شروع ہوُا، نئے آدابِ مجلس، نئے رسم و رواج، اور نئے ذوق نے رواج پایا۔ ان کے ساتھ طرح طرح کے کپڑے، قالین اور فرش فروش، سامان آسائش، نئے آلاتِ جنگ، نئے پھول اور پھل اور نئے قسم کے کھانے، نئی قسم کی صناعی، نئی قسم کی اصطلاحات اور الفاظ یہاں آئے اور رائج ہوئے۔ انھوں نے یہاں کے حالات میں ایک عجیب تغیر پیدا کردیا اور سارے ماحول میں ایک نیا رنگ رؤپ نظر آنے لگا۔ اس جدید ذوق، اس جدید تہذیب اور جدید خیالات کے ادا کرنے کے لیے جو اس ماحول میں ساری تھے، سوائے فارسی کے کوئی دؤسری زبان نہ تھی۔ ایک تو اس لیے کہ اس زبان میں شیرینی، لچک، وسعت تھی، الفاظ و اصطلاحات کا ذخیرہ موجود تھا اور بنے بنائے اور ڈھلے ڈھلائے بیان کے سانچے تیار تھے۔ دوسرے، اس میں لکھنے سے تحریر اہلِ بصیرت اور اصحابِ ذوق کی نظر سے گزرتی تھی اور ہندستان ہی میں نہیں اس سے باہر بھی پہنچتی تھی اورتحسین حاصل کرتی تھی۔ تیسرے، رواج کی پابندی اور ماحول کا اثر خود بخود اس طرف کھینچ لاتا تھا۔ چوتھے اس میں کسی قدر

مشیخت کا بھی شائبہ تھا۔ اس میں ہندو مسلمان سب برابر تھے، دونوں کی تحریریں پڑھیے، ذرہ برابر فرق نہیں پایا جاتا۔ یہ اس لیے نہیں تھا کہ مغلوں نے فارسی سیکھنے کے لیے جبر کر رکھا تھا۔ اس کے عہد میں علم اور زبان کی عام آزادی تھی، بلکہ انھوں نے سنسکرت اور دوسری دیسی زبانوں کی بڑی سرپرستی کی جس کی وجہ سے انھیں بہت فروغ ہوا۔ چنانچہ اُن کے عہد میں سنسکرت کے اعلیٰ مصنف اور سنسکرت اور ہندی کے بہت سے نامور شاعر ہوئے ہیں۔ فارسی کی طرف یہ عام رجحان جدید حالات اور ماحول کا نتیجہ تھا، ہندستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے اکثر ممالک میں زبان کے معاملے میں اکثر رواداری کا برتاؤ تھا اور لوگ غیر زبان بولنے اور غیر زبان لکھنے میں نہیں جھجکتے تھے۔

لیکن یہ آزادی اور رواداری دنیا میں زیادہ مدت تک نہیں رہی۔ ایک زمانہ آیا جب کہ مذہب اور عقیدے کی طرح زبان بھی سیاسی لپیٹ میں آگئی۔ جرمنوں نے فرانسیسیوں کی نفرت کی وجہ سے فرانسیسی اور دوسری زبانوں کے لفظ اپنی زبان سے اسی طرح خارج کر دینے شروع کر دیے جیسے آج وہ یہودیوں کو اپنے ملک سے جلا وطن کر رہے ہیں۔ اسی طرح سیواجی کے زمانے میں مرہٹی زبان سے عربی فارسی کے الفاظ نکال دینے کی کوشش کی گئی۔ آئرلینڈ میں محض انگریزی کی مخالفت میں آئرش زبان کے زندہ کرنے کی جدوجہد جاری ہے۔ ترکوں نے اپنی زبان سے غیر زبانوں کے لفظ نکالنا شروع کر دیے ہیں۔ ایران میں پہلے بھی ایک کوشش ہوئی لیکن ناکام رہی۔ اب وہ پھر ترکوں کی طرح غیر زبانوں کے الفاظ نکال دینے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ زبان کے لیے اب لڑائیاں چھڑ جاتی ہیں، دوسری زبانوں کو مٹانے اور فنا کرنے کے لیے جابرانہ احکام اور آئین نافذ کیے جاتے ہیں، یہاں تک کہ شہروں اور مقاموں تک کے

نام بدل دیے جاتے ہیں۔

زبان اور قومیت اب تک ایک دوسرے کا جزو لاینفک سمجھے جاتے ہیں اور جب اس کے ساتھ مذہب بھی آ شریک ہوتا ہے تو یہ بادۂ تلخ دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ (یہی صورت ہندستان میں پیش آئی۔ سنہ ۵۷ء کے بعد کمپنی بہادر برخاست ہوئی۔ انگریزی راج آیا، حالات نے پلٹا کھایا، جدید قانون نافذ ہوئے، جو آگے تھے پیچھے اور جو پیچھے تھے آگے ہو گئے۔ چند ہی سال بعد قومیت کا خیال جو سارے یورپ پر چھایا ہوا تھا اُڑتا ہوا یہاں بھی پہنچا۔ ریل اور تار کی حیرت انگیز اختراعوں، کالجوں کی تعلیم، آزادی اور حب وطن کی تقریروں اور تحریروں، انگریزی انصاف پسندی کے اعتقاد نے قومیت اور وطنیت کے جذبے کو اور اُکسایا۔ خاص کر ہنود اس سے زیادہ متاثر ہوئے، وہ اس نئے دور کو اپنے حق میں آزادی کا دور سمجھے، اس کے ساتھ ہی اپنی شاندار قومیت اور ماضی کے فخر نے بھی دلوں میں نیا جوش پیدا کیا جسے میکس مولر نے اُبھارا اور جس سے بعد میں اپنی بزاتش نے خوب کام لیا۔ لیکن سب سے زیادہ مستحکم طور پر یہ خیال سوامی دیانند سرسوتی نے دلوں میں جمایا، گروکل قائم ہوئے جس میں سنسکرت پڑھنا اور سنسکرت بولنا لازم تھا، ویدک زمانے کی معاشرت کی نقل کی جانے لگی، ننگے پانو پھرنا، ایک بے سلی چادر اوڑھنا لپیٹنا، جنگلوں میں رہنا، زیر سما سونا وغیرہ وغیرہ قومی شعار قرار پایا۔ اسی قومیت کے جذبے، مقدس قدامت اور ماضی کے غرور، نام نہاد نئی آزادی اور نئی تعلیم نے اس میں نشے کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ وہ طرح طرح سے اپنی نئی حیثیت اور انفرادیت جتانے لگے اور جس طرح ایک بے وقوف عورت نے اپنی خوب صورت انگوٹھی دکھانے کی خاطر گھر کو آگ لگا دی تھی انھوں نے بھی بہانے بنا بنا کر گڑ

بگاڑنا شروع کیا۔ سب سے پہلے نزلہ اُردو زبان پر گرا۔ اس کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ یہ اسلامی عہد کی پیداوار تھی۔ یہ سچ ہے کہ اس زمانے میں اس نے جنم لیا لیکن صرف مسلمان اس کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ یہ درحقیقت اس زمانے کے ماحول اور اس تمدن اور تہذیب کی مخلوق تھی جو مسلمانوں کے آنے کے بعد ہندستان میں رونما ہوئی اور جس میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے شریک ہیں اور اردو کے بنانے میں تو (یہ میرا ذاتی خیال ہے) ہندو شریک غالب تھے۔ اور چونکہ یہ اس ماحول میں پیدا ہوئی جس کی تعمیر ہندو مسلمان دونوں کے ہاتھوں سے ہوئی اس لیے اس میں بہ نسبت کسی دوسری ہندی زبان کے عربی، فارسی کے الفاظ زیادہ تھے۔ اور وہ بھی سب ملا کر کتنے؟ بقول مولانا حالی "جتنا آٹے میں نمک"۔ حیرت ہے کہ آریا اس ملک میں آئیں اور ہندی کہلائیں، مغل، ترک، عرب یہاں آباد ہوں اور ہندستانی بن جائیں، اور بیسیوں قومیں یہاں آئیں اور دیسی ہو جائیں لیکن بقول عورتوں کے "جنم جلے" لفظ ہی ایسے ہیں جو صدہا سال رہنے سہنے کے بعد بھی غیر کے غیر ہی رہے اور اپنے نہ ہونے پائے۔ اب انھیں محض اس شبہے پر کرید کرید کر اور اکھیڑ اکھیڑ کر نکالنا نادانی نہیں، دیوانہ پن ہے۔ قومی غرور میں اکثر ایسا ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی بدتر حرکتیں سرزد ہوتی ہیں۔ مثلاً جرمنوں نے لفظوں پر مشق کرتے کرتے انسانوں پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ حالانکہ یہ ایک موٹی سی بات ہے کہ جب لفظ ہماری زبان میں آگیا اور رس بس گیا تو وہ غیر زبان کا نہیں رہتا، ہمارا ہو جاتا ہے۔ اسے اگر ہم نکال دیں تو سوائے ہماری زبان کے اس کا کہیں ٹھکانا نہیں رہتا۔ دوسری زبان رل جانے سے نہ اس کی وہ پہلی سی صورت اور چہرہ مُہرہ رہتا ہے اور نہ

سیرت و خصلت ، وہ اگر اپنی اصلی زبان کی طرف جائے گا تو پہچان بھی نہ پڑے گا اور کوئی اسے وہاں گھسنے نہ دے گا۔ اس کے علاوہ اصل زبان کا اس میں کوئی نقصان نہیں ، نقصان ہو تو اُس زبان کا جس میں یہ آکر بس گئے تھے اور جن کی وجہ سے اُس زبان کی رونق ، وسعت اور قوتِ اظہار میں اضافہ ہو گیا تھا۔

زبان کی یہی گت اس ہندی اُردو جھگڑے میں بنی۔ عربی ، فارسی ہی کے نہیں بلکہ ہندی کے معمولی لفظ بھی جو عام طور پر بول چال میں رائج ہیں خارج اور ان کی جگہ سنسکرت کے اصل لفظ داخل کیے جا رہے ہیں۔ یہ زبان کا بنانا نہیں، بگاڑنا ہے۔

بعض حضرات نے اس نزاع کا الزام سر سید احمد خاں کے سر تھوپا ہے ان کا بیان ہے کہ جب سر سید نے انڈین نیشنل کانگرس کی مخالفت کی تو ہندی اُردو کا جھگڑا پیدا ہؤا۔ یہ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ جب یہ جھگڑا اٹھا ہے تو اس وقت کانگرس کا وجود بھی نہ تھا۔ اس کے متعلق خود سر سید کا بیان موجود ہے ہم اسے کیوں نہ دیکھیں۔ وہ علی گڑھ کی تعلیمی سروے میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "تیس برس کے عرصے سے مجھ کو ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، خیال پیدا ہؤا ہے اور ہمیشہ میری یہ خواہش تھی کہ دونوں مل کر دونوں کی فلاح میں کوشش کریں۔ مگر جب سے ہندو صاحبوں کو یہ خیال پیدا ہؤا کہ اردو زبان اور فارسی کو جو مسلمانوں کی حکومت اور ان کی شاہنشہی ہندستان کی باقی ماندہ نشانی ہے، مٹا دیا جائے اس وقت سے مجھ کو یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمان باہم متفق ہو کر ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کر سکتے۔ میں نہایت درستی اور اپنے تجربے

اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا ہے، اس کی ابتدا اسی سے ہوئی" جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے، اس کی ابتدا سنہ ۶۷ء میں بنارس میں ہوئی اور ایسے بُرے وقت ہوئی کہ اب تک ختم ہونے کو نہیں آئی، بلکہ دن بدن زور پکڑتی جاتی ہے۔ لیکن اس وقت بھی بعض منصف مزاج اور عاقبت اندیش ہندو اہلِ قلم نے اس نئی تحریک کی مخالفت کی، چنانچہ سنہ ۱۸۶۹ء میں منشی حکم چند پروفیسر دہلی کالج نے ایک مدلّل اور محققانہ مضمون اس کی مخالفت میں لکھا پروفیسر موصوف زبانوں کی حقیقت اور ارتقا وغیرہ پر بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں:-

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خالص زبان اور میل والی (مخلوط) زبان میں کیا خاص فرق ہے اور اول الذکر کو ثانی الذکر کے مقابلے میں کیوں خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا دنیا میں کوئی زبان بھی ایسی کہی جاسکتی ہے جس میں بدیسی الفاظ شامل نہ ہوگئے ہوں؟ اگر کوئی ایسی زبان موجود ہو تو اس کو ترجیح کی کوئی وجہ نہیں۔ میل والی زبان میں اجنبی الفاظ کچھ عرصے کے استعمال کے بعد کھپ جاتے ہیں اور مقامی رنگ اختیار کرلیتے ہیں اور اس میل والی زبان کو بھی ہم خالص زبان کہہ سکتے ہیں۔ دراصل یہ تمام امور اردو زبان کی بحث سے خارج ہیں اس واسطے کہ اردو ایک زندہ زبان ہے اور اس قدر زمانے سے ہندستان میں استعمال کی جارہی ہے کہ اس کو ترک کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھایا جاسکتا۔ یہ بحث بالکل بے نتیجہ ہے کہ آیا اردو ایک خالص زبان ہے یا اس میں دوسری زبانوں کا بھی میل ہے۔ اب ہندو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اس جگہ ہندی کو رواج دیں جس کا استعمال عرصے سے ترک کردیا گیا ہے اور جس کی حیثیت اب ایسی ہی ہے جیسی کہ سنسکرت کی

ایک زمانہ تھا جب دلّی والے جامہ پہنا کرتے تھے، لیکن اب لوگوں نے یہ لباس ترک کر دیا ہے۔ اب اگر کوئی یہ لباس پہن کر بازار میں جائے تو لوگ کیا کہیں گے؟ اکثر لوگ بہروپ سے تعبیر کریں گے۔ زبانوں کا بھی یہی حال ہے۔ اب اگر آپ "بدن" کی جگہ "شریر" اور شیر کی جگہ "سنگھ" استعمال کریں تو لوگ آپ کی بات سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ فارسی رسم خط کی جگہ جو ناگری رسم خط استعمال کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اس کا بھی یہی حال ہے۔ دراصل اگر ایک دفعہ بدیسی الفاظ کسی زبان میں چل جائیں تو زبان خالص بنانے کے لیے انھیں بے دخل نہیں کیا جا سکتا اور نہ رسم خط بدلا جا سکتا ہے۔ فردوسی نے شاہنامے میں عربی الفاظ استعمال نہیں کیے لیکن کیا دوسرے فارسی شعرا جیسے خاقانی، انوری، نظامی وغیرہ اس کا تتبع کر سکے؟ برخلاف اس کے ان کے یہاں کثرت سے عربی الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس اصول پر ہم اردو میں عربی، فارسی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں اور کیوں نہ کریں؟ شہروں میں ہر چھوٹا بڑا اردو بولتا ہے اور سرکاری دفاتر میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے، اردو میں اخبارات کی بڑی تعداد شائع ہوتی ہے اور تعداد میں ہر روز مزید اضافہ ہو رہا ہے۔ اردو میں دوسری زبانوں کے مطالب بیان کرنے کی بدرجۂ اتم صلاحیت پائی جاتی ہے"۔

اسی زمانے میں گارساں دتاسی لکھتے ہیں کہ "باوجود ان مباحث کے جن کی نسبت ہم نے ابھی ذکر کیا ہے اردو ہندستان کی مشترکہ زبان کی حیثیت سے مسلّم ہے۔ ڈیوک آف اڈنبرا نے اسی زبان میں اپنے دوران سفر میں تقریریں کیں اور اسی زبان میں ڈیوک موصوف کی تعریف و توصیف میں قصیدے لکھے گئے۔ آج کل ساؤتھ کنزنگٹن میوزیم میں شہزادہ البرٹ کی جو

نمایش ہو رہی ہے اس کے نیچے اردو زبان میں کتبہ لکھا گیا ہے"

اسی مضمون میں دوسرے مقام پر لکھتے ہیں "اگرچہ صوبۂ بنگال کی زبان بنگالی ہے لیکن اردو جیسا کہ میں پیشتر بوضاحت بیان کر چکا ہوں وہاں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ راجا کالی کرشن پرشاد نے حال میں ملکۂ وکٹوریہ کی سال گرہ کے موقع پر سنسکرت میں جو نظم لکھی تھی اس کا اردو میں ہی ترجمہ شائع کیا ہے، جس کی ایک نقل انھوں نے مجھے بھی بھیجی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ موصوف نے اس کا بنگالی میں ترجمہ شایع نہیں کیا"۔

پھر لکھتے ہیں "اگر کوئی ہندو اسلامی حکومت کو بُرا کہے اور انگریزی نظم و نسق کا مدّاح ہو تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن عربی، فارسی اور اردو جیسی زبانوں کے ساتھ تعصّب برتنا کسی طرح بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ بابو شیو پرشاد جیسے عالم فاضل شخص سے مجھے اس کی توقع نہ تھی، اس لیے ان کی تحریر دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ بابو صاحب خود اردو نہایت عمدہ لکھتے ہیں اور متعدد تصانیف اس زبان میں شایع کر چکے ہیں۔ یہ خواہش کرنا کہ ہندستان میں سوائے سنسکرت، ہندی یا انگریزی کے اور کسی زبان کی تحصیل ہی نہ کی جائے، میرے خیال میں تنگ نظری پر دلالت کرتا ہے۔ میں سید احمد خاں کی طرح اس باب میں زیادہ وسیع مشرب واقع ہوا ہوں"۔

اُس زمانے میں اس نئی تحریک پر بڑی گرما گرم بحثیں ہوئیں اور دونوں فریق نے تائید و تردید میں خوب خوب دل کا بُخار نکالا۔ اس زمانے کا کوئی اخبار یا رسالہ شاید ہی اس بحث سے خالی ہو۔ اس کے بعد کچھ عرصے کے لیے یہ بحث دھیمی پڑ گئی اور لوگ سیاسی اور معاشرتی مسائل کی طرف متوجہ ہو گئے۔ لیکن سر انٹونی میکڈانل کے عہد جبروت عہد میں اس دبی آگ کو پھونکیں مار مار کر

سُلگایا گیا۔ اور ابھی کچھ دنوں دم نہ لینے پائے تھے کہ شدھی اور سنگھٹن نے وہ شعلے بھڑکائے جن کی آنچ اب تک کم نہیں ہوئی ہو اور جو آتا گیا ایک آدھ کُپا تیل کا اور لنڈھاتا گیا۔

انگریز بہت خوش اقبال ہو کہ ہر قرن اور ہر دور میں کوئی نہ کوئی بات ایسی نکل آتی ہو کہ ہم آپس میں کٹ مرتے ہیں اور وہ اس کے مزے لیتا ہو۔

رشید احمد صدیقی صاحب فرماتے ہیں کہ میں ہندی اردو کے قضیے سے بیزار ہوں۔ اُن سے زیادہ میں بیزار ہوں، میں اب سے پہلے کبھی اس بحث میں نہیں پڑا تھا، یہ میرے شعار کے خلاف تھا بلکہ جہاں کہیں میں نے ضرورت سمجھی ہندی کی حمایت ہی کی۔ جامعۂ عثمانیہ میں ہندی کے رواج دینے میں تھوڑی سی میری ناچیز کوشش کو بھی دخل تھا۔ تین سال کا ذکر ہو کہ جب مدراس میں بعض پروفیسروں اور دیگر صاحب ذوق اصحاب نے اردو اکاڈمی کی بنیاد ڈالی تو اس وقت احاطۂ مدراس میں ہندی کی اشاعت اور پروپیگنڈے کا بھی ذکر آیا تو میں نے یہی کہا کہ ہمیں ہرگز اس کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے، جس قدر ان میں ہندی کا زیادہ رواج ہوگا اسی قدر وہ ہم سے زیادہ قریب ہو جائیں گے، کیونکہ ہندی سے زیادہ ہندستان کی کوئی زبان اُردو سے زیادہ قریب بلکہ اقرب نہیں ہو (افسوس ہو کہ مجھے قربت کا لفظ استعمال کرنا پڑا جس سے دوئی کی بو آتی ہو، حالانکہ کچھ پہلے ہماری ایک ہی زبان تھی) لیکن جب میں نے دیکھا کہ واقعات کا خون کیا جا رہا ہو اور دانستہ یا نادانستہ طرح طرح کی غلط بیانیاں پھیلائی جا رہی ہیں تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے جھجکتے جھجکتے اپنی طبیعت کے خلاف اپنی کم زور آواز اور اس سے بھی کم زور اپنے قلم سے کسی قدر کام لیا۔ مجبوری میں آدمی کو کبھی کبھی ایسا بھی کرنا پڑتا ہو۔

حال میں اس معاملے میں دو قسم کی غلط فہمیاں پیدا کی گئی ہیں ایک یہ کہ ہندی دو ہزار برس سے یہاں جاری ہے اور یہی ہندستانی زبان ہونی چاہیے۔ ہندی کا لفظ عام ہے۔ اس کا اطلاق برج بھاشا، اودھی، بندیلی، بگھیلی، راجستانی، بھوج پوری، میتھلی، چھتیس گڑھی وغیرہ وغیرہ پر اسی طرح ہوتا ہے جس طرح اردو پر ہوتا ہے کہ وہ بھی ایک زمانے میں ہندی کہلاتی تھی۔ مگر وہ ہندی جس کی خاطر یہ سارا طوفان برپا کیا گیا ہے اس کی پیدائش کو بقول شخصے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوتے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے منشیوں نے (خدا ان کی ارواح کو شرمائے) بیٹھے بٹھائے بلاوجہ اور بغیر ضرورت یہ شوشہ چھوڑا۔ للوجی لال نے جو اردو کے زبان دان اور اردو کتابوں کے مصنف بھی تھے، اس کی بنا ڈالی، وہ اس طرح کہ اُردو کی بعض کتابیں لے کر انھوں نے ان میں سے عربی، فارسی لفظ چُن چُن کر الگ نکال دیے اور ان کی جگہ سنسکرت اور ہندی کے نامانوس لفظ جما دیے، لیجیے ہندی بن گئی۔ جدید ہندی کی تاریخ سے جو واقف ہیں وہ سب اس پر متفق ہیں کہ اس کی ابتدا اسی طرح سے ہوئی۔ یہاں میں بخوف طوالت ان رایوں کو نقل نہیں کرنا چاہتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ مشکل ہے اور بھدّی ہے۔ فٹز ایڈورڈ ہال جو ایک جیّد عالم گزرے ہیں اور ہندی زبان کے بڑے حامیوں میں سے تھے اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ "ہندی زبان جیسی کہ وہ آج کل مستعمل ہے دراصل بالکل جدید زبان ہے اور انیسویں صدی کے خاتمے پر جو ہندی رائج ہوگی وہ بہت مختلف ہو جائے گی"۔ ان کی پیشین گوئی حرف بحرف صحیح نکلی۔

دوسری غلط بیانی یہ کی گئی کہ اردو کو مسلمان بادشاہوں نے حکومت کے زور سے پھیلایا اور اُس وقت ہندوؤں نے بحالت مجبوری سیاسی مصلحت سے

قبول کر لیا۔ یہ بیان سرتا پا غلط اور بے بُنیاد ہے۔ یہ بات اگر کوئی اور کہتا تو قابل التفات نہ ہوتی لیکن یہ الفاظ ایسے شخص کے قلم سے نکلے ہیں جو اردو اور ہندی دونوں کا مسلم ادیب تھا اور اپنے اخلاق اور سیرت کے لحاظ سے معمولی آدمی نہ تھا۔ اس لیے اور بھی زیادہ تعجب اور افسوس ہوتا ہے۔ اُردو زبان کی تاریخ ایسی صاف اور کھلی چیز ہے کہ اس پر بحث کرنے یا اس بیان کی تردید کرنے کی مطلق ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ مسلمان بادشاہوں کے دربار اور دفتر کی زبان ہمیشہ فارسی رہی، اُن کو اتنی توفیق ہی نہ ہوئی کہ وہ غریب اردو کی طرف توجہ فرماتے اور توجہ کی تو کس وقت؟ جب نہ سلطنت رہی، نہ حکومت، اور ظاہر ہے ایسے وقت میں ان کا اثر ہی کیا ہو سکتا تھا۔ اردو زبان جدید ہندی کی طرح کسی نے بنائی نہیں، وہ تو خود بخود بن گئی اور ان قدرتی حالات نے بنائی جن پر کسی کو قدرت نہ تھی۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے اور اگر ہندوؤں کی اس میں شرکت نہ ہوتی تو یہ وجود ہی میں نہیں آ سکتی تھی۔ مسلمان بادشاہوں پر یوں تو بہت سے الزام عائد کیے گیے ہیں لیکن یہ بالکل نیا الزام ہے اور حال ہی میں گھڑا گیا ہے۔

حضرات! اب میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اردو کی مقبولیت کے کیا اسباب ہوئے۔ سب سے بڑی وجہ اس کی مقبولیت عام کی یہ ہوئی کہ اس کی بنیاد عوام کی زبان پر رکھی گئی تھی جو بول چال کی زبان تھی۔ خود اردو کا لفظ ہی اس کی اصل اور ابتدا کا پتا دیتا ہے۔ اس وقت جتنی شائستہ اور اعلیٰ درجے کی زبانیں ہیں جن کی دھاک ساری دنیا پر بیٹھی ہوئی ہے وہ ایک وقت میں عوام کی معمولی بولیاں تھیں اور حقارت کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں، یہاں تک کہ خود اہل زبان اس میں لکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ بعینہٖ یہی حال

پہلے پہلے اردو کا بھی تھا۔ اس کے بولنے والے بھی اس میں لکھتے ہوئے
ہچکچاتے تھے اور جو کبھی کوئی لکھتا اور وہ بھی مذہبی ضرورت سے ہوتا تھا تو پہلے
معذرت کرتا کہ چونکہ سب عربی فارسی نہیں جانتے اس لیے ان کی خاطر سے
اس زبان میں لکھ رہا ہوں ۔ لیکن آخر یہی عوام کی بولی رفتہ رفتہ شائستہ اور
ادبی زبان بن گئی اور اب تک اس کا تعلق برابر عوام کی بولی سے رہا ۔
میں نے جو بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے جلسے میں یہ کہا تھا کہ اردو میں ہندی زبان
کے الفاظ اور محاورے اور امثال جدید ہندی کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہیں
تو یہ میں نے محض دھونس بٹھانے کے لیے نہیں کہا تھا بلکہ یہ امر واقعی ہے۔ ادبی
زبان بننے پر بھی وہ عوام کی بولی سے جدا نہیں ہوئی ، برخلاف جدید ہندی
کے کہ وہ کتابی زبان ہے۔ انھیں جب کبھی الفاظ کی ضرورت پڑی تو انھوں
نے سنسکرت کے ذخیرے کو ٹٹولا ، ہمارے پاس پہلے سے ہندی کے لفظ
موجود تھے اور بعد میں بھی ہم نے ہندی سے نئے لفظ لینے میں بُخل نہیں کیا۔
عوام کی زبان مثل قلب کے ہے جس سے تمام اعضا کو خون پہنچتا رہتا ہے اور
ان کی تقویت کا باعث ہوتا ہے۔ جب تک زبان کو عوام کی بولی سے مدد ملتی
رہتی ہے اور وہ عوام کی بولی کا ساتھ دیتی رہتی ہے اور جس وقت سے اس کا
تعلق عوام کی بولی سے منقطع ہوجاتا ہے تو اسی وقت سے اُس پر مُردنی کے
آثار نمایاں ہوجاتے ہیں ۔ چنانچہ یونانی ، سنسکرت، لاطینی جو دنیا کی کامل
اور بہترین زبانیں خیال کی جاتی ہیں اسی لیے مُردہ ہوگئیں ۔

البتہ اُردو پر ایک ایسا تاریک زمانہ آیا تھا کہ ہمارے شعرا نے اکثر
ہندی لفظوں کو متروک قرار دیا اور ان کی بجائے عربی فارسی کے لفظ
بھرنے شروع کیے ، اور یہی نہیں بلکہ بعض عربی فارسی الفاظ جو بہ تغیر ہیئت

یا بہ تغیر تلفظ اردو میں داخل ہو گئے تھے، انھیں بھی غلط قرار دے کر اصل صورت میں پیش کیا اور اس کا نام "اصلاح زبان" رکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تکلّف اور تصنّع ہمارے ادب پر چھا گئے تھے، شاعری ضلع جگت ہو گئی تھی، سخنوروں نے لفظوں کو کھیل بنا لیا تھا۔ شاعر کا مقصد کچھ کہنا نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کا کام قافیے کی رعایت سے لفظوں کو جما دینا، ان میں صنائع و بدائع کا رنگ بھر دینا، قافیہ ردیف کھپا دینا اور محاوروں کا نباہ دینا رہ گیا تھا۔ اس میلان کی وجہ سے ہماری شاعری رنگ برنگ لفظوں کا ایک ڈھانچا تھی جس پر طرح طرح کی نقاشی کی ہوئی تھی لیکن اس میں جان نہ تھی۔ اور ہماری زبان ایک ایسی زبان ہو گئی تھی کہ اسے بہت کم انسان بولتے تھے۔ غرض اس رنگ نے ہمارے ادب کو بے جان، بے لطف اور بے اثر بنا دیا تھا۔

لیکن یہ دورِ تاریکی چند روزہ تھا، اس کے رفع کرنے میں سب سے بڑا کام سید احمد خاں نے کیا۔ اس کی تحریروں نے ہمارے ادب میں نئی جان ڈال دی۔ اگرچہ اس کی زبان اور اس کا انداز بیان سادہ تھا لیکن اس میں فصاحت، اثر اور قوت تھی۔ اس نے علمی اور سنجیدہ مضامین لکھنے کا نیا ڈول ڈالا اور موافق و مخالف دونوں نے اس کی پیروی کی۔ اور اس کے رفقا یعنے نذیر احمد، شبلی، حالی، اور ذکاء اللہ خاں وغیرہ نے اسے اور چمکایا اور بڑھایا۔ سیّد احمد خان کا اُردو پر بڑا احسان ہے۔ اس نے صرف ہمارے ادب ہی کو نہیں بنایا اور سنوارا بلکہ ہر موقع پر جب ضرورت پڑی اس کی حمایت کی اور اس پر آنچ نہ آنے دی۔ سر سید کی وجہ سے اب اردو ادب کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا ہے جو "علی گڑھ اسکول" کے نام سے موسوم ہے۔

اس نئے اسکول نے پھر عام بول چال کی طرف رجوع کی اور خاص کر نذیر احمد، حالی، آزاد، ذکاءاللہ نے ان الفاظ کو جو گھروں کے کونوں کھدروں، گلیوں بازاروں اور کھیتوں میں کس مپرسی کی حالت میں پڑے تھے چُن چُن کے نکالا انھیں جھاڑا پونچھا، صاف کیا، جلا دی اور ان میں سے بہت سے اچھوتوں کو مسندِ عزّت پر لا بٹھایا۔ اس نئے خون نے جو ہمیشہ ہماری زبان کی رگ و پے میں پہنچتا رہا ہی، ہمارے ادب کی رونق اور تازگی کو دوبالا کر دیا۔

حضرات! اردو کی مقبولیت کی ایک اور وجہ بھی ہوئی جو قابلِ غور ہی۔ جس وقت یہ زبان وجود میں آئی تو ملک میں جتنی بولیاں مروج تھیں وہ سب اپنے چھوٹے چھوٹے رقبوں اور حلقوں میں محدود تھیں، یہ زبان قدرت سے ایسے ماحول اور ایسے حالات اور اس قسم کے اثرات کے تحت بنی تھی اور اس طرح سے اس کی ترکیب عمل میں آئی تھی کہ وہ خود بخود ملک کے اکثر خطّوں میں پھیلتی گئی اور لوگ اسے قبول کرتے چلے گئے۔ ملک میں کوئی دوسری بولی یا زبان ایسی نہ تھی جو اس کا مقابلہ کرتی اور جتنی بولیاں یا زبانیں تھیں وہ اپنے حلقے سے باہر نہ بولی جاتی تھیں اور نہ سمجھی جاتی تھیں، یہی وجہ ہی کہ جب اہلِ یورپ اور خصوصًا انگریز اس ملک میں آئے تو انھوں نے اسے ہندستانی یعنے ہندوستان کی زبان سے موسوم کیا۔ اور یہی وجہ ہی کہ جب فارسی کی بجائے اردو سرکاری دفاتر کی زبان قرار پائی تو کسی نے اختلاف نہ کیا۔ اختلاف ہوتا تو کس بنا پر؟ کوئی دوسری زبان ایسی تھی ہی نہیں جو ہندستانی ہونے کا دعویٰ کرتی۔

اردو زبان کی ایک اور خصوصیت بھی ہی جس پر بہت کم توجہ کی گئی ہی۔

وہ عورتوں کی زبان ہو۔ یوں تو دنیا میں اور بھی زبانیں ہیں جن میں مردوں اور عورتوں کی بول چال میں کچھ کچھ فرق ہو لیکن اردو زبان میں یہ امتیاز بہت نمایاں اور گہرا ہو۔ اردو نے جس خطّے میں جنم لیا یا جہاں جہاں اس نے زیادہ رواج پایا وہاں پردے کی رسم رائج رہی ہو۔ اسی وجہ سے مردوں اور عورتوں کی معاشرت میں بہت کچھ فرق پیدا ہوگیا۔ عورتوں کے الفاظ اور محاورے اور ان کا طرزِ بیان اور بول چال بھی بہت کچھ الگ ہوگئی۔ عورتوں کی نظر بڑی تیز ہوتی ہو، وہ انسانوں یا چیزوں میں بعض ایسی چھوٹی چھوٹی خوبیاں یا کمزوریاں دیکھ لیتی ہیں جن پر مردوں کی نظر نہیں پڑتی۔ پردے میں رہنے کی وجہ سے ان کا سارا وقت امورِ خانہ داری، بال بچوں کی پرورش اور نگہداشت، شادی بیاہ، رسم و رواج کی پابندی اور ان کے متعلق جتنے معاملات ہیں اس میں صرف ہوتا ہو اور اس اقلیم میں ان کی عمل داری کامل ہوتی ہو۔ پھر ان کی زبان اور لہجے میں قدرتی لطافت، نزاکت اور لوچ ہوتا ہو اس لیے انھوں نے اپنے تعلقات کے لحاظ سے جو طرح طرح کے لفظ، محاورے اور مثلیں بنائی ہیں وہ بڑی لطیف، نازک، خوب صورت اور سبک ہیں۔ وہ گیت جو عورتوں نے بنائے ہیں بہت ہی پُرلطف اور دل کش ہیں اور نفسیاتی اعتبار سے خاص طور پر قابلِ قدر ہیں۔ ایسے الفاظ جن کا زبان سے نکالنا بدتمیزی سمجھا جاتا ہو یا جن کے کہنے میں شرم و حجاب مانع ہوتا ہو، عورتیں ایسے الفاظ نہیں بولتیں بلکہ وہ اس مفہوم کو لطیف پیرائے میں یا تشبیہ اور استعارے کے رنگ میں بڑی خوب صورتی سے بیان کر جاتی ہیں۔ عربی فارسی کے ثقیل الفاظ جن کا تلفظ آسانی سے ادا نہیں ہوتا وہ انھیں بہت سڈول بنا لیتی ہیں، بعض اوقات ان کے معنے تک بدل جاتے ہیں اور وہ خالص

اردو کے لفظ ہوجاتے ہیں۔ ہماری عورتوں کے الفاظ اور محاورے وغیرہ زیادہ تر ہندی ہیں یا عربی فارسی کے لفظ ہیں تو انھیں ایسا تراشا ہے کہ ان میں اردو کی چمک دمک پیدا ہوگئی ہے۔ اب جدید حالات کچھ ایسے ہوگئے ہیں کہ جہاں ہماری اور بہت سی عزیز چیزیں مٹتی جاتی ہیں یہ لطیف زبان بھی مٹتی جاتی ہے۔ ریختی گو شعرا کا بڑا احسان ہے (اگرچہ ان میں سے بعض نے بہت کچھ فحش بھی بکا ہے) کہ انھوں نے اس زبان کو محفوظ کردیا ہے۔ اس زبان کے سینکڑوں ہزاروں الفاظ اور محاورے اور مثلیں ادبی زبان میں آگئی ہیں اور ہمارے ادب کی زیب وزینت ہیں۔ اس زمانے میں نذیر احمد، حالی، سید احمد دہلوی، راشد الخیری اور بعض دیگر اصحاب کی بدولت صنف نازک کی اس پاکیزہ زبان کا اکثر حصہ ہمارا مشترکہ سرمایہ ہوگیا ہے۔ اس کے اضافے سے ہماری زبان میں شگفتگی اور حسن ہی نہیں پیدا ہوا بلکہ اسے مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔

حضرات! آج کل ہر طرف سے یہ آواز سنائی دی جارہی ہے کہ "سادہ زبان لکھو۔ سہل لکھو"، گویا سادہ اور سہل لکھنا معمولی بات ہے۔ ایک ادیب کا قول ہے کہ "ایک اعلیٰ درجے کے باکمال شخص اور ایک احمق میں صرف ایک ہی چیز مشترک ہے اور وہ ہے سادگی"۔ ایسی سادہ زبان لکھنا جس میں سلاست کے ساتھ لطف بیان اور اثر بھی ہو، صرف باکمال ادیب کا کام ہے۔ محض سیدھے سادے لفظ جمع کردینا اور سپاٹ، بے لطف، بے جان تحریر لکھنا نہ لکھنے سے بدتر ہے۔ ہر شخص کا طرز اور اسلوبِ بیان جدا ہوتا ہے، ادب و شعر میں کوئی کسی کو مجبور نہیں کرسکتا کہ یوں نہیں یوں لکھو۔ حکم سے یا فرمائش سے کسی کو سادہ لکھنا نہیں آسکتا۔ زبان میں ہر قسم کے الفاظ کا ذخیرہ موجود ہے اور ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ اپنے مضمون یا مقتضائے حال کے

مطابق جو الفاظ موزوں اور برمحل ہوں، استعمال کرے۔ جب ہم کسی بچّے یا کسی گنوار سے باتیں کرتے ہیں یا بچوں کے لیے کوئی کتاب لکھتے ہیں تو خود بخود سادہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ سادہ یا مشکل، فصیح یا سلیس لکھنا حالات اور ضرورت پر منحصر ہی اور زیادہ تر لکھنے والے پر اس کا انحصار ہی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہی اور کس سے کہنا چاہتا ہی۔ ہماری زبان ہمیں عوام سے، ان پڑھ لوگوں سے، گنواروں سے، سپاہیوں سے پہنچی ہی اور اس لیے اس کا تعلق کبھی عوام سے منقطع نہیں ہونا چاہیے۔ بڑا آدمی وہ ہی جس کی آواز سیکڑوں، ہزاروں تک پہنچتی ہی اور اس سے بھی بڑا وہ ہی جس کی آواز لاکھوں کروڑوں تک پہنچتی ہی اور دنیا میں سب سے بڑا وہ ہی جس کی آواز تمام بنی نوع انسان تک پہنچ سکتی ہی۔ جس کا پیام جس قدر سادہ الفاظ میں ہوگا اسی قدر زیادہ انسانوں تک پہنچے گا۔ سید احمد خاں بڑا شخص ہوا ہی کیونکہ اس کی آواز لاکھوں آدمیوں تک پہنچتی تھی، اس لیے کہ اس کی تحریر سادہ، پُراثر اور پُرخلوص تھی۔ اگر ہم میں اپنے بھائیوں کا درد ہی تو ہماری تقریر اور تحریر ضرور سادہ اور سہل ہوگئی۔ لیکن بے چارے ادیب یا مصنّف ہی کی گردن دبانا کہ "تو سہل لکھ"، ٹھیک نہیں ہی۔ ہمیں دوسرے پہلو کو بھی دیکھنا چاہیے۔ آسان اور مشکل اضافی کلمے ہیں۔ ممکن ہی کہ جو چیز مجھے مشکل معلوم ہوتی ہی وہ آپ کے لیے آسان ہو اور جسے میں آسان سمجھتا ہوں وہ آپ کے لیے مشکل ہو۔ انگریزی کی ایک بہت آسان کتاب لیجیے اور اس کا ترجمہ اردو میں کیجیے۔ اردو میں آکر یہ آسان کتاب مشکل ہو جاتی ہی۔ کیوں؟ اس لیے کہ اصل کتاب جس ملک والوں کے لیے لکھی گئی تھی وہاں تعلیم عام ہی، پڑھے لکھوں کی تعداد بہت زیادہ ہی۔ وہ الفاظ اور محاورے اور اصطلاحیں جو اس کتاب میں آئی ہیں

انھیں وہاں بچّہ بچّہ جانتا ہے اب جو ہم نے اپنی زبان میں ترجمہ کیا تو پڑھے لکھے بھی اسے نہیں سمجھتے، پڑھے لکھے تو رہے ایک طرف بعض وقت خود مترجم نہیں سمجھتا کہ میں نے کیا لکھا ہے۔ اسی لیے جہاں سادہ لکھنے کی فرمائش اور چیخ پکار ہے وہاں اپنے ملک کی جہالت رفع کرنے اور علم کی روشنی پھیلانے کی بھی کوشش کرنی چاہیے، پھر کچھ ناخواندہ طبقہ ذرا اُوپر اُٹھے گا اور کچھ ہمارے ادیب اور مصنف ذرا نیچے جھکیں گے، اس طرح دونوں کے درمیان تفاوت کم رہ جائے گا اور وہ ایک دوسرے کی بات آسانی سے سمجھنے لگیں گے۔

یہ کچھ ایسی مشکل نہیں ہے۔ لیکن ہماری مشکلات اور بھی ہیں اور ان کی طرف اب خاص طور پر توجہ کی جارہی ہے۔ مگر اب تک ان کے حل کرنے کی صورت پیدا نہیں ہوئی ان میں سے ایک علمی اصطلاحات کا ترجمہ ہے۔ میں اس کے متعلق بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن یہاں نہ اتنا وقت ہے اور نہ مجھے اتنی فرصت ملی کہ تفصیل سے کچھ لکھتا۔ لیکن اتنا ضرور عرض کردینا چاہتا ہوں کہ ہم نے جو اصطلاحات کو ہوّا بنا رکھا ہے یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ قدیم زمانے میں پروہتوں اور مذہبی پیشواؤں نے مذہب کو اور اہل علم نے علم کو پُراسرار بنا رکھا تھا۔ وہ عام آدمی کو اس کا اہل نہیں سمجھتے تھے اور اسی لیے علم ایک خاص طبقے کے قبضے میں رہتا تھا۔ عام کرنے سے ان کے اقتدار میں فرق آتا تھا۔ اسے قائم رکھنے کے لیے انھوں نے ایسی اصلاحات گھڑلی تھیں جنھیں دیکھتے ہی آدمی مرعوب ہوجائے۔ یہ خیال تو رفتہ رفتہ جاتا رہا لیکن اس کا اثر باقی رہ گیا۔ آپ نے انگریزی میں لاطینی اور یونانی زبانوں سے مشتق اصطلاحیں دیکھی ہوں گی جو

کس قدر بے ڈھنگی بے ڈول اور بھیانک ہیں، ہمیں اس کی تقلید نہیں کرنی چاہیے۔ جہاں تک ممکن ہو ہمیں اصطلاحات کے لیے ایسے الفاظ رکھنے چاہییں کہ ایک معمولی لکھا پڑھا شخص بھی اس کے کسی جزو سے واقف ہو اور لفظ اور مفہوم میں جو تعلق ہو اُسے تھوڑا بہت پالے۔ اس سے اُسے معنی کے سمجھنے میں بھی آسانی ہوگی اور اصطلاح کے یاد رکھنے میں بھی۔

اسی طرح رسم الخط اور املا کی اصلاح اور سہل بنانے کا مسئلہ ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ ایسے ٹائپ کے بنانے کا مسئلہ ہے جو ہماری زبانوں کے لیے موزوں ہو۔

یہ سب مسائل ہماری توجہ کے قابل ہیں۔ ہمیں ایک طرف اپنے ادب کو مستحکم اور علوم و فنون سے مالا مال کرنا ہے اور دوسری طرف اپنی زبان کی اشاعت منظور ہے، اس لیے ان تمام وسائل اور ذرائع پر غور کرنا ہمارا فرض ہے جو ہماری زبان کو زندہ رکھنے اور ترقی دینے کے لیے ضروری ہیں۔ ان تمام امور پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں لیکن انجمن ترقیٔ اردو ان سب پر غور کر رہی ہے اور انشاءاللہ جلد جلد ان کو عمل میں لانے کی کوشش کرے گی۔

اگر ہمیں یہ یقین ہے کہ ہماری زبان ہی ایسی زبان ہے جو سارے ہندستان کی عام اور مشترک زبان ہو سکتی ہے، اگر ہمیں یہ یقین ہے کہ اس میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت ہے، اگر ہم سچے دل سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ زبان ہماری تہذیب اور ہماری زندگی کا جز ہے تو صاحبو! اگر ہمیں اس کے لیے زیادہ نہیں تو تھوڑا سا تردّد، تھوڑی سی تکلیف برداشت کرنی پڑے تو اس سے گریز نہ کریں اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کم سے کم اتنا تو ہو کہ جب کوئی دوسرا اس کے لیے سرگردانی کے لیے تیار ہو تو اس کا ہاتھ بٹانے میں دریغ نہ کیا جائے۔

خطبۂ صدارت سندھ پراونشل اُردو کانفرنس

مولانا نے یہ خطبہ بحیثیت صدر سندھ پراونشل اُردو کانفرنس
۳۱ دسمبر ۱۹۳۷ء کو کراچی میں پڑھا۔

(مرتّب)

یہ زمانہ عجیب و غریب انقلابات و تغیرات اور عجیب و غریب اختراعات و ایجادات کا ہے۔ ہم وہ عجائبات دیکھ رہے ہیں جنھیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ تار برقی، ٹیلیفون، ایروپلین اور دُور بینی (Television) نے عالم میں انقلاب پیدا کردیا ہے۔ زمان و مکان جن کی وسعت اور بے پایانی انسانی فہم سے بالا ہے آج اس خاک کے پُتلے کے سامنے سکڑ کر رہ گئے ہیں۔ گھر بیٹھے ہزاروں کوس کی تقریریں اس طرح سُنتے اور وہاں کے کھیل تماشے اس طرح دیکھتے ہیں گویا یہ سب کچھ ہمارے سامنے ہو رہا ہے۔ ان ایجادات کی بدولت سفر میں حضر اور حضر میں سفر کا لُطف پیدا ہوگیا ہے۔ آمد و رفت، خط و کتابت، حمل و نقل، تعلیم و تعلّم میں دُنیا ایک ہوتی جاتی ہے۔ انسانی دماغ نے یہ تو سب کچھ کیا لیکن زبان کے معاملے میں یہ اب تک عاجز ہے۔ ہر ملک کی الگ الگ زبان اور ہر زبان میں کئی کئی بولیاں ہیں۔ جب دو غیر زبان یا غیر ملک والے ایک جگہ آملتے ہیں تو باوجود نطق کے جو قدرت کا بہت بڑا عطیّہ ہے گونگے بن جاتے ہیں اور حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اشاروں اور ہاتھ آنکھ

کے چلانے سے دو ایک موٹی موٹی ضرورتیں پوری کرلیں۔ لیکن نہ معاملات پر گفتگو کر سکتے ہیں اور نہ اپنے دل کی بات دوسرے کو سمجھا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ تمدنی، تہذیبی اور علمی ضروریات اس امر کی مقتضی ہیں کہ دنیا کے پردے پر مختلف حصوں میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا فوراً ہم تک پہنچنا ضروری ہے۔ آج کل حالت یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں جلد جلد تغیرات ہو رہے ہیں، نئے نئے اکتشافات، نئی نئی ایجادیں، طرح طرح کے نظریے عمل میں آرہے ہیں اور ایک ایسے شخص کے لیے جو علم کا پیاسا ہے یا کسی تحقیقات میں مصروف ہے ان معلومات کا فوری علم لازم ہے۔ اور جب تک دوسرے ذرائع یا ترجمے کی وساطت سے یہ معلومات اُس تک پہنچیں دنیا آگے نکل جاتی ہے، یہ پیچھے رہ جاتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عمر بھر کی کمائی اکارت جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بنی نوع انسان کے بعض ہمدردوں نے اس ابتری اور افراتفری کو دیکھ کر ایک بین اقوامی زبان "یا جگت بھاشا" ایجاد کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوششیں مختلف زبانوں میں ہوئیں اور بڑے اچھے اچھے دماغوں نے اس پر محنت کی لیکن اب تک اس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی اور اس نقص کی وجہ سے انسان اب تک بہت سی خامیوں اور ناکامیوں کا شکار بنا ہوا ہے۔

گو کوئی جگت بھاشا اب تک نہیں بنی اور نہ ابھی کوئی توقع ہے لیکن باوجود اس کے جب تجارت، کشورکشائی، جلا وطنی نے مختلف زبانوں کے لوگوں کو ایک جگہ لا ملایا تو باہم متواتر سابقہ پڑنے یا دوسرے دیس میں بس جانے سے ان لوگوں نے ایک دوسرے کی زبانوں کو گڈمڈ کر کے ایک نئی زبان بنالی اور اسی میں بات چیت، لین دین، کاروبار اور معاملات انجام دینے لگے۔

دنیا میں اس قسم کی متعدد زبانیں ہیں۔ ان میں سے ایک ہماری زبان بھی ہے جو اردو یا ہندستانی کے نام سے موسوم ہے جو کسی بادشاہ کے خبط یا کسی حکیم کی حکمت یا کسی خوش فکر کے وہم کا نتیجہ نہیں بلکہ انسانی ضروریات کا اقتضا اس کا باعث ہوا۔

جگت بھاشا نہیں تو نہ سہی، کم سے کم ہمارے پاس ایک ایسی زبان تو ہے جسے ہم "دیش بھاشا" کہہ سکتے ہیں۔ ایک ایسے ملک میں جہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی تھیں اور بولی جاتی ہیں، ایک ایسی زبان کا ہونا لازم تھا۔ قانون قدرت نے اپنا کام کیا اور انسانی ضرورت نے اسے لبّیک کہا اور رواج نے اسے پھیلایا۔ اس لیے کہ جب اسلامی سلطنت کو یہاں استحکام ہوا، حکومت کو وسعت ہوئی، امن و عافیت میں ترقی ہوئی، مختلف صوبوں میں ربط قائم ہوا، آمد و رفت اور میل جول کی آسانیاں پیدا ہوئیں، نئے سامان ظہور میں آئے، حالات و خیالات میں تغیر ہوا اور ایک جدید ماحول کا دوْر شروع ہوا تو ان حالات اور ماحول کے لیے ایک نئی زبان کی ضرورت واقع ہوئی کیونکہ اس وقت جتنی زبانیں ہندستان میں رائج تھیں وہ سب اپنے اپنے حلقے میں محدود تھیں اور اس نئی خدمت کے انجام دینے سے قاصر تھیں۔ فارسی ہر چند کہ سرکاری درباری زبان تھی اور اپنی خوبیوں کی وجہ سے ہندستان، افغانستان، ایران نیز مملکت روم تک چھائی ہوئی تھی مگر آخر غیر زبان تھی اور ملکی زبان نہیں ہو سکتی تھی (بعینہٖ جیسے اس وقت انگریزی)۔ اس لیے ایک زبان کی جگہ خالی تھی۔ اس خالی جگہ کو خود بخود اس نئی زبان نے پُر کیا جو ضروریاتِ وقت کے لحاظ سے دونوں قوموں یعنے ہندو مسلم کی شرکت اور اتحاد سے بنی تھی۔ یہی ہماری دیش بھاشا ہے۔ یہی ہماری

ملکی اور قومی زبان ہے کیونکہ اس کی تخلیق کی غرض و غایت ہی یہی تھی - اب کوئی دوسری، خواہ نئی ہو یا پرانی، اس سے یہ منصب نہیں چھین سکتی -

اس قسم کی مخلوط زبانوں کے بننے کے دَوران میں ایک خاص بات عمل میں آتی ہے جو قابل غور ہے یعنے ان میں سے ہر زبان کو اس خیال سے کہ جانبین کو ایک دوسرے کی بات آسانی سے اور جلد سمجھ میں آسکے اپنی بعض خصوصیات کو ترک کرنا پڑتا ہے اور صرف ایسی صورتیں باقی رکھنی پڑتی ہیں جو یا تو مشترک ہوتی ہیں یا جن کا اختیار کرنا دونوں کے لیے سہل ہوتا ہے اور اس طرح ان میں ایک توازن سا پیدا ہو جاتا ہے جو فریقین کے لیے سہولت کا باعث ہوتا ہے - اُردو یا ہندستانی کے بننے میں بھی یہی ہوا - فریقین یعنی ہندو مسلمان دونوں نے اپنی اپنی زبانوں میں کتر بیونت کی، اپنی مخصوص خصوصیات کو ترک کیا اور اس قربانی کے بعد جو نئی زبان بنی اسے اختیار کیا جو ضرورت زمانہ کے مطابق اور حالات کے مناسب تھی اور جو اب ہماری ملکی اور قومی زبان ہے اور ہندستان کی مشترک اور عام زبان کا درجہ حاصل کر چکی ہے - ہم نے اسے قربانی کر کے حاصل کیا ہے اور کسی کا یہ منہ نہیں ہو سکتا کہ وہ ہم سے اسے چھڑا سکے -

اس قسم کی مخلوط زبانیں دنیا میں جہاں جہاں ہیں ان میں سے اکثر اور غالبًا سب کی سب بول چال اور کاروبار کی حد تک کام آتی ہیں - یہ امتیاز صرف اردو کو حاصل ہے کہ وہ لشکر اور بازار سے نکل کر مسند انشا تک پہنچی، رونق محفل شعرا ہوئی، علم و ادب کا سہارا بنی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آج یونیورسٹی کے اعلیٰ مضامین اور علم کا ذریعۂ تعلیم ہے - یہ وہ درجہ ہے جو اب تک ہندستان کی کسی زبان کو حاصل نہیں ہوا -

کہا جاتا ہو کہ اب نیا زمانہ آگیا ہو، نئے حالات ہوگئے ہیں۔ نئے دور نے جنم لیا ہو، نئے خیالات کی آمد ہو، اس لیے اب زبان بھی نئی ہونی چاہیے۔ بے شک ایک زمانہ ایسا تھا کہ نئے حالات اور خیالات اور جدید ماحول کی وجہ سے بھی ایک جدید زبان کی ضرورت تھی اور وہ اس لیے کہ پہلے سے ملک میں کوئی زبان موجود نہ تھی۔ اب جب کہ ایک زبان بن چکی، ملک میں رائج ہوچکی، ملک کی عام اور مشترک زبان مانی جاچکی تو اس کے ہوتے کسی دوسری زبان کا بنانا سودائے خام اور خیال باطل ہو۔

ہاں یہ ضرور ہو کہ ایک ایسی زبان میں جو ملک بھر کی زبان ہونے کا دعویٰ رکھتی ہو اتنی صلاحیت اور استعداد ہونی چاہیے کہ وہ زمانے کا ساتھ دے سکے اور نئے خیالات اور افکار ادا کرسکے۔ یہ ہر زندہ زبان کے لیے لازم ہو ورنہ وہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ یہ صلاحیت اس میں پوری پوری موجود ہو جس کے لیے مجھے اس وقت شہادت پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ الفاظ کا ذخیرہ روز بروز بڑھتا جاتا ہو، نئے نئے اسلوبِ بیان پیدا ہوتے جاتے ہیں، نظم و نثر کا رنگ بدلتا جاتا ہو، نئی اصطلاحات وضع ہوتی جاتی ہیں، مغربی تصانیف کے ترجمے ہو رہے ہیں، مختلف علوم پر تالیفات کی جارہی ہیں۔ یہ سب باتیں ہماری زبان کی زندگی پر دلالت کرتی ہیں۔

ایک حکیم کا قول ہو کہ غیر اقوام کے لوگوں کو اپنی قوم میں اس طرح جذب کرلینا کہ اپنے اور غیر میں کوئی امتیاز نہ رہے بلاشبہ بہت مشکل کام ہو لیکن غیر زبانوں کے الفاظ کو اپنی زبان میں اس طرح جذب کرلینا کہ معلوم تک نہ ہو کہ یہ غیر ہیں، اس سے بھی زیادہ مشکل کام ہو۔ یہ استعداد اردو زبان میں بدرجۂ کمال موجود ہو۔ اس میں سینکڑوں، ہزاروں الفاظ غیر زبانوں کے اس طرح

گھل مل گئے ہیں کہ بولنے، پڑھنے والوں کو خبر تک نہیں ہوتی کہ یہ دیسی ہیں یا بدیسی، اپنے ہیں یا پرائے۔

میں علی الاعلان یہ کہتا ہوں اور اس کہنے میں مجھے ذرا بھی تامّل نہیں کہ ہم ہندی، سندھی یا ہندوستان کی کسی زبان کے بھی مخالف نہیں بلکہ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ہر زبان کو زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا حق ہے۔ لیکن یہ امر مسلّم ہے اور ہر طبقے اور ملت کا اس پر اتفاق ہے کہ کوئی ایک زبان ایسی ضرور ہونی چاہیے جو ہماری ملکی اور قومی زبان ہو۔ اب بحث اس میں ہے کہ وہ کون سی زبان ہو۔

ہمارا کہنا یہ ہے اور ہم اس کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ایک ایسی زبان پہلے سے موجود ہے جسے اردو یا ہندستانی کہتے ہیں۔ یہ وجود میں آئی ہی اس غرض سے تھی۔ اقتضائے وقت نے اسے پیدا ہی اسی لیے کیا تھا۔ یہ اب تک ملکی اور مشترکہ زبان سمجھی جاتی رہی اور مشترکہ زبان کا کام دیتی رہی اور اس وقت بھی یہی خدمت انجام دے رہی ہے۔ میرا یہ دعویٰ اس لیے نہیں کہ یہ میری زبان ہے بلکہ یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔

رہی ہندی، سو اس کے مخالف تو ہم ہو ہی نہیں سکتے، اس لیے کہ وہ ہماری ہی ساختہ پرداختہ ہے۔ ہمیں نے اس کو فروغ دیا اور پھیلایا کیونکہ جب مسلمان یہاں آئے تو جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے ہر علاقے کی بولی الگ الگ تھی۔ نہ ملک کی کوئی عام زبان تھی اور نہ کوئی ایک حکومت تھی اور نہ ذرائع آمد و رفت، وسیع تھے اس لیے ہر بولی کا حلقہ محدود تھا۔ مسلمان فاتحوں کی زبان فارسی تھی۔ جب انھوں نے دہلی کو اپنا دارالحکومت بنایا تو وہاں کی ایک مقامی بولی سے جو اب کھڑی بولی کہلاتی ہے اور جس کے معنے عوام کی بولی کے ہیں، فارسی کی مڈبھیڑ ہوئی۔ جیسے جیسے ہندو مسلمانوں میں

میل جول بڑھتا گیا ان دونوں زبانوں میں بھی ربط ضبط بڑھنا شروع ہوا۔ اور رفتہ رفتہ یہ دونوں ایسی گھل مل گئیں کہ فارسی اور کھڑی بولی کا کوئی امتیاز باقی نہ رہا اور جوں جوں اسلامی سلطنت پھیلتی گئی اس کا دامن بھی وسیع ہوتا گیا اور یہ بولی جسے کوئی جانتا پہچانتا نہ تھا ہماری بدولت سارے ہندستان میں پہنچی۔ سلطنت کی فوجیں، صوفی و درویش، علما و شعرا، عمال و حکام جہاں گئے اسے اپنے ساتھ لے گئے اور ہندستان کے گوشے گوشے سے اسے روشناس کرادیا۔ ہم اس کی مخالفت کیوں کر کرسکتے ہیں؟ یہ ہماری زبان کی زینت اور رونق بلکہ اس کی جان ہے۔ اگر آج ہم اپنی زبان سے اسے خارج کردیں تو ہماری زبان مہمل اور بے معنی ہو جائے گی۔

لیکن ہاں ہم اس جدید ہندی کے بے شک مخالف ہیں جو ہندستان کی دو بڑی قوموں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے بنائی گئی ہے، جس کی بنیاد نئی قومیت کے جوش اور فرقہ واری جذبے پر ہے، جس کا منشا عربی فارسی الفاظ کو خارج کرکے ان کی بجائے سنسکرت اور ہندی کے نامانوس الفاظ رائج کرنا ہے حالانکہ وہ عربی فارسی الفاظ صدہا سال سے رس بس کے ہندستانی زبان کا جزو ہو گئے ہیں۔

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ ہندستانی یا اردو مخلوط زبان ہے، یہاں کی خالص زبان نہیں۔ اول تو دنیا کی کوئی زبان خالص نہیں دوسرے ہماری زبان کا مخلوط ہونا عیب نہیں بلکہ اس کی خوبی ہے۔ اس سے اس کا یہ دعویٰ اور بھی قوی ہو جاتا ہے کہ وہی ملک کی مشترکہ زبان ہے۔ نیز اس اختلاط کی وجہ سے اس میں ایک ایسی وسعت، قوت اور فراوانی پیدا ہوگئی ہے کہ ادیب کو ہر قسم کے خیالات نئے نئے ڈھنگ سے ادا کرنے اور صحیح اور موزوں لفظ کے

انتخاب میں جو سہولت ہے وہ شاید ہی ہندستان کی کسی دوسری زبان میں ہو۔
مخلوط ہونے سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ نئے الفاظ کے بنانے اور ترکیب دینے کے لیے ایک وسیع میدان ہاتھ آجاتا ہے۔ ایک ایسی زبان کے لیے جو علمی اور ادبی ہونے کی آرزو یا دعویٰ رکھتی ہے یہ بہت بڑی چیز ہے۔
جدید ہندی کے حامیوں نے زبان کو خالص بنانے کی یہ ترکیب نکالی ہے کہ فارسی عربی کے لفظ چُن چُن کر نکال دیے جائیں اور ان کی جگہ سنسکرت یا ہندی کے لفظ داخل کیے جائیں خواہ وہ مانوس ہوں یا نہ ہوں، سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں۔ یہ نہایت احمقانہ خیال ہے۔ انشا پرداز یا ادیب کے پیش نظر یہ اصول ہونا چاہیے کہ عام استعمال میں سب سے بہتر لفظ کون سا ہے خواہ کسی زبان کا ہو۔ الفاظ کے انتخاب میں لفظ کی نسل و اصل کو نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ کونسا لفظ خیال کو صحت اور خوبی کے ساتھ ادا کرنے کی قابلیت رکھتا ہے۔ الفاظ کے انتخاب کی بنیاد اس اصول پر رکھنا کہ کوئی لفظ غیر زبان کا نہ آنے پائے خواہ کیسا ہی موزوں، صحیح اور عام فہم کیوں نہ ہو نہایت گمراہ کن اصول ہے اور زبان کے حق میں سخت مضر ہے۔
میں آپ کو ایک چھوٹا سا واقعہ سناتا ہوں کوئی ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوتا ہے میں میرٹھ سے دہلی جا رہا تھا۔ گاڑی ایک گانو کے اسٹیشن پر ٹھیری۔ وہاں سے دو ہندو صاحب سوار ہوئے۔ آج کل گنّے کی کاشت کا بہت رواج ہو رہا ہے اُدھر بھی جگہ جگہ لوگوں نے سہولت کے لیے اسٹیشنوں کے قریب گنّے کی کاشت کے ساتھ گڑ بنانے کے کارخانے قائم کر رکھے ہیں۔ گنّے کا پھوک اور دوسرا کوڑا کرکٹ ریلوے لائن کے قریب

پھینک دیتے ہیں جس سے بہت بدبو پھیل جاتی ہے۔ چنانچہ جب گاڑی چلی اور بدبو آئی تو میں نے کہا کہ اس گانو سے بہت بدبو آرہی ہے اُن ہندو صاحب نے فرمایا کہ یہاں گڑ کا کارخانہ ہے اس کی وجہ سے سخت تعفن پیدا ہوگیا ہے۔ اس گفتگو میں ان صاحب نے تعفن کا لفظ استعمال کیا اور میں نے بدبو کا۔ لیکن میں بدبو کو تعفن پر ترجیح دیتا ہوں اس لیے نہیں کہ یہ لفظ میں نے کہا تھا اور نہ اس لیے کہ تعفن عربی لفظ ہے اور بدبو ہندستانی، بلکہ اس لیے کہ یہ زیادہ عام فہم اور سہل ہے اور بالکل وہی مفہوم ادا کر رہا ہے جو تعفن۔ لیکن اگر کوئی قیمت، دکان، کتاب کی جگہ نامانوس ہندی یا سنسکرت کے لفظ استعمال کرے گا تو میں کبھی روا نہ رکھوں گا۔ اگرچہ قیمت اور دکان عربی اور فارسی کے لفظ ہیں لیکن وہ اس قدر عام طور پر رائج اور اس قدر مختصر اور سہل ہیں کہ ان کی جگہ ثقیل اور نامانوس الفاظ استعمال کرنا ذوقِ سلیم کا خون کرنا ہے۔

ایک اور غضب آج کل یہ ہو رہا ہے کہ اچھے خاصے ٹھیٹ ہندی لفظوں کی جگہ جان جان کر ثقیل نامانوس سنسکرت لفظ داخل کیے جا رہے ہیں یا ان اصل سنسکرت الفاظ کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لایا جا رہا ہے جو کسی قدر تغیر کے بعد ہندی اور اردو میں آگئے ہیں۔ مثلاً برس کو ورش، گانو کو گرام کہیں گے حالانکہ برس اور گانوٗ خاص و عام سب کی زبان پر ہیں اور خالص ہندی ہیں۔ یا مثلاً پیر نہیں پد کہیں گے۔ اس قسم کے سینکڑوں لفظ نئے نئے داخل کیے جا رہے ہیں جن کی تفصیل خواہ مخواہ موجبِ طوالت ہوگی۔ اس سے ان کی نیّت کا پتا چلتا ہے۔ میں آپ کو ایک لطیفہ سناتا ہوں۔ میرا ایک ہندو طالب علم ریل میں سفر کر رہا تھا اسے دیا سلائی کی ضرورت

ہوئی تو اس نے اپنے ہم سفر ہندو نوجوان سے مانگی۔ اس نے دیا سلائی تو دے دی مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اب اس کا نام دیا سلائی نہیں رہا۔ طالب علم نے حیرت سے پوچھا کہ پھر اب اسے کیا کہتے ہیں؟ اس نے کہا "دھومر شلاکا" اس حماقت اور بد ذوقی کی کوئی انتہا ہے؟ دیا سلائی ٹھیٹ ہندی لفظ ہے اور اس کے دونوں جز ہندی ہیں پھر ایک نہایت عام فہم، سادہ اور خوب صورت لفظ ہے، اس کی جگہ دوسرا ثقیل، نا مانوس مہمل لفظ استعمال کرنا کس قدر حیرت انگیز ہے۔ آخر اس کا کیا مطلب ہے؟ مطلب ظاہر ہے اور مجھے اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔

ابھی چند روز کا ذکر ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی کا کانووکیشن ایڈریس پنڈت مدن موہن مالویہ جی نے ہندی زبان میں ارشاد فرمایا۔ اگرچہ میرے لیے کوئی نئی چیز نہ تھی کیونکہ جامعۂ عثمانیہ کا ذریعۂ تعلیم اعلیٰ جماعتوں تک اردو ہے اور وہاں ہر سال کانووکیشن کا ایڈریس اُردو ہی میں پڑھا جاتا ہے لیکن مجھے اس سے بے انتہا خوشی ہوئی کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ برٹش انڈیا کی ایک پرانی یونیورسٹی میں کانووکیشن ایڈریس ایک دیسی زبان میں سنایا گیا۔ پنڈت جی نے شروع میں حاضرین سے انگریزی زبان میں دو باتوں کی اجازت چاہی ایک تو یہ کہ میں بیماری کی وجہ سے بہت کمزور ہوں، اپنی تقریر بیٹھ کر کروں گا۔ دوسرے یہ کہ میں اپنی تقریر اپنی مادری زبان میں کروں گا۔ اس کے بعد جو انھوں نے تقریر شروع کی تو وہ سنسکرت آمیز ہندی میں تھی۔ اس پر ایک طالب علم نے (خدا اس کی ہمت میں برکت دے) اُٹھ کر کہا "جناب میں آپ کی زبان نہیں سمجھ سکتا" اس پر پنڈت جی چونکے اور انھوں نے ایسی ہندی میں تقریر کی جو آدھی مادری زبان تھی اور آدھی پدری۔ پنڈت جی علاوہ سنسکرت اور

انگریزی کے عالم ہونے کے ہندستانی زبان کے بھی ادیب ہیں۔ جن لوگوں نے کچھ عرصہ قبل ان کی تقریریں سنی ہیں وہ شہادت دے سکتے ہیں کہ وہ کیسی شستہ اور فصیح ہندستانی یعنی اردو بول سکتے ہیں۔ لیکن ان اثرات اور حالات کی وجہ سے جو آج کل ہماری بدنصیبی سے ملک پر چھائے ہوئے ہیں انھوں نے اپنا رُخ بدل دیا ہی۔ جب ایسے پختہ کار دُور اندیش اور ہمدرد بزرگ جن سے اصلاح و مصالحت کی توقع ہی مضر اثرات سے نہیں بچ سکتے تو نوجوانوں اور بے خبر لوگوں سے کیا شکایت ہوسکتی ہی۔ ایک بات ان کی تقریر میں یہ نظر آئی کہ جب انھیں کوئی ہندی لفظ نہیں ملتا تھا تو اردو یا فارسی کا مروّجہ لفظ نہیں استعمال کرتے تھے بلکہ اس کی جگہ انگریزی لفظ کو ترجیح دیتے تھے۔ سنسکرت کے جو اقوال ان کی تقریر میں آتے تھے اس کا ترجمہ وہ ہندستانی میں نہیں بلکہ انگریزی میں فرماتے تھے۔ یہ سب باتیں صاف بتاتی ہیں کہ ہوا کا رُخ کس طرف ہی۔

ہم ان باتوں کے روادار نہیں ہوسکتے۔ بدگمانی بُری چیز ہی لیکن بدگمانی پیدا کرنے والوں کو کیا کہا جائے؟ انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے ریزولیوشن میں صاف طور سے اس امر کا اعلان کیا ہی کہ ملک کی زبان ہندستانی ہوگی لیکن اس معزّز جماعت نے کبھی اس کو عمل میں لانے کی کوشش نہیں کی۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کے ممتاز ارکان ہندی کی اشاعت پر تُلے ہوئے ہیں تو ہماری بدگمانی بالکل بجا ہی۔ ابھی حال میں ایک راجہ نے ایک بیش قرار رقم مسٹر سی راج گوپال اچاریہ کی خدمت میں اس غرض سے پیش کی ہی کہ وہ اسے ہندی کی اشاعت میں صرف کریں۔ سی راج گوپال اچاریہ کانگریس کے رکن اعظم اور صوبۂ مدراس کی کانگریس حکومت کے وزیر اعظم ہیں۔

انھیں چاہیے تھا کہ وہ شکریہ کے ساتھ اس رقم کو واپس کر دیتے اور صاف کہہ دیتے کہ کانگریس کے عقیدے اور اصول کے رُو سے وہ اس رقم کو قبول نہیں کر سکتے، ہاں اگر ہندستانی کی اشاعت کے لیے دیے جاتے ہیں تو بسروچشم قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس سے ظاہر ہی کہ ہندستانی کا ریزولیوشن بھی ایک سیاسی چال تھی۔

حضرات! زبردستی فاقے کرنے، پُرجوش سیاسی تقریریں کرنے یا خوشنما الفاظ میں ریزولیوشن منظور کر لینے سے دل نہیں بدلتے۔ دل بدلنے والی چیزیں اور ہی ہوتی ہیں۔

حال ہی میں پنڈت جواہر لال نہرو نے زبان کے مسئلے پر ایک رسالہ شایع کیا ہی۔ اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ اُردو شہروں کی زبان ہی اور ہندی دیہات کی۔ یہ بیان سراسر خلاف واقعہ اور غلطی پر مبنی ہی۔ پنڈت جی نے یا تو لاعلمی کی وجہ سے یا اُس عام پروپیگنڈے کی بنا پر جو ہر طرف کیا جا رہا ہی یہ لکھ دیا ہی ورنہ وہ جدید زبان جسے آج کل ہندی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہی ہندستان کے کسی دیہات میں نہیں بولی جاتی۔ میرٹھ یا دلّی کے دیہات والے کے لیے بہار کے دیہات والے کی بولی ایسی اجنبی ہی جیسے ایک لاہوری کے لیے ملتانی۔ ہندی کا لفظ مبہم ہی اور اس سے مغالطہ پیدا کیا جا سکتا ہی لیکن ہم اس غلطی یا دھوکے میں نہیں آنا چاہتے۔ ہمیں قطعی طور سے یہ طے کر لینا چاہیے کہ ہندستانی یعنے اردو ہمارے ملک کی زبان ہی اور اس کی اشاعت اور ترقی میں ہمارے ملک کی بہبودی ہی۔

اے اہل سندھ! اگرچہ اردو کی ابتدا آپ کے ملک میں نہیں ہوئی

لیکن سب سے پہلے مسلم ہندو تہذیبوں کی یک جائی آپ ہی کے ہاں شروع ہوئی اور آپ ہی نے یک جہتی میں وہ رنگ پیدا کیا جس کے نمونے کچھ دنوں پہلے تک دونوں قوموں کے رفتار وگفتار، خوراک و پوشاک وغیرہ میں نظر آتے تھے۔ اب بھی آپ کی زبان میں ہزاروں عربی فارسی کے لفظ بے تکلف بول چال اور تحریر میں آتے ہیں۔ گویا آپ نے وہ زمین تیار کی جس پر آگے چل کر اردو کے چمن نے رونق اور سرسبزی حاصل کی۔ اگرچہ ہم دونوں کی یک جہتی اور اتحاد کی اور بہت سی نشانیاں اب بھی موجود ہیں اور بہت سی مٹتی جاتی ہیں لیکن یہ زبان جو اردو یا ہندستانی کہلاتی ہے ہندو مسلم یک جہتی اور اتحاد کی سب سے بڑی اور زندہ یادگار ہے۔ اس کی ساخت اور ترکیب میں دونوں قوموں کے اعلیٰ دماغ اور افکار، دونوں قوموں کی بے ریا اور متحدہ کوششوں اور دونوں قوموں کے ادبی نتائج کا نچوڑ موجود ہے۔ اب بھی اگر کوئی چیز ہمارے اتحاد کا ذریعہ ہوسکتی ہے تو یہی ہے۔ اب بھی اگر ہمارے بکھرے شیرازے کو ایک رشتے میں منسلک کرسکتی ہے تو یہی ہے۔ اس کے قایم رکھنے میں ہماری سعادت مندی اور اس کے پھیلانے اور ترقی دینے میں ہماری قومی بہبودی ہے۔

آپ کے صوبے کی زبان یو۔پی، پنجاب اور بہار کو چھوڑ کر دوسرے صوبوں کے مقابلے میں اردو سے قریب تر ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہزارہا فارسی عربی کے لفظ آپ کی زبان میں رس بس گئے ہیں۔ فارسی زبان کا تسلط یہاں صدہا سال تک رہا ہے، عربی کی تعلیم اب تک جاری ہے، رسم خط تقریباً وہی ہے جو اردو کا ہے اور یہ سب سے بڑی سہولت ہے جو آپ کو حاصل ہے۔ جملے کی ترکیب اور ترتیب وہی ہے جو اُردو زبان

کی ہو۔ آپ کے صوبے میں سینکڑوں اُردو کے ادیب اور شاعر ہوئے ہیں اور اب بھی موجود ہیں۔ اردو کے اخبار اور رسالے بھی نکلتے ہیں۔ مشاعرے بھی یہاں اسی دھوم دھام سے ہوتے ہیں جیسے ہندستان کے دوسرے شہروں میں۔ اس لیے آپ کو اس زبان کی تحصیل و اشاعت میں بہت سی آسانیاں حاصل ہیں جو ہندستان کے بعض دوسرے صوبوں کو حاصل نہیں۔ جب جنوبی آرکاٹ میں ٹنڈی ونم اور شمالی آرکاٹ میں وانم باڑی اور نیلگری وغیرہ اضلاع کے لوگ اردو کو حاصل ہی نہیں کرتے بلکہ اپنی مادری زبان کی طرح بولتے، پڑھتے اور لکھتے ہیں تو میرے خیال میں اہل سندھ ان سے کہیں بہتر اس میں مہارت پیدا کر سکتے ہیں اور اگر وہ ذرا بھی اس طرف توجہ کریں گے تو چند ہی سال میں ان میں ایسے ایسے ادیب اور شاعر ہونے لگیں گے جیسے پنجاب، یو۔پی، بہار اور حیدرآباد دکن میں۔

آپ نے سندھ پراونشل اردو کانفرنس کا اہتمام بڑی شان اور سلیقے سے کیا ہو۔ یہ بہت اچھا خیال ہو۔ اس کی سخت ضرورت تھی اور آپ کی یہ سعی قابل مبارک باد ہو۔ اس میں فصیح و بلیغ تقریریں ہوں گی، دلکش اور پُراثر نظمیں پڑھی جائیں گی، مفید اور ضروری ریزولیوشن پیش ہوں گے، اردو کی اشاعت و ترقی کی تجویزوں پر غور ہوگا، مشاعرے کی دھوم دھام ہوگی۔ بلاشبہ یہ تحریک بہت کارآمد اور قابل قدر ہو۔ اس سے اردو کا چرچا ہوگا، مطالعہ کا شوق بڑھے گا اور لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ لیکن کیا آپ کی رائے میں ایک ایسی زبان کے لیے جسے آپ سارے ہندستان کی عام اور مشترک زبان خیال کرتے ہیں یا عام اور مشترک زبان بنانے کی آرزو رکھتے ہیں، اس قسم کے چند ہنگامے کر دینے کافی ہوں گے؟

زمانے کی رفتار میں اس وقت غیر معمولی سُرعت نظر آتی ہے۔ خود ہمارے ملک میں جو تغیرات گزشتہ چند سال سے رونما ہو رہے ہیں وہ کم حیرت انگیز نہیں ہیں۔ اس لیے اگر ہم اپنے مقصد کے حصول میں زیادہ تیزی، زیادہ مستعدی اور زیادہ تن دہی سے کام نہ لیں گے تو ہم پہلے سے بھی پیچھے رہ جائیں گے۔

اُردو زبان کی اشاعت اور اردو ادب کی ترقی بجائے خود ایک اہم مسئلہ ہے۔ اس معاملے میں ہر صوبے اور ہر علاقے کی حالت جُدا جُدا ہے اس لیے کام کی نوعیت میں بھی پوری یکسانی نہیں ہوگی۔ لیکن میں اپنے ذاتی تجربے نیز اُن اطلاعات کی بنا پر جو مجھے مختلف مقامات سے وصول ہوتی رہتی ہیں، یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہر صوبے اور ہر علاقے میں کثرت سے لوگ اُردو زبان کے سیکھنے کے خواہاں ہیں۔ لیکن کام کرنے والے نہیں اور کہیں ہیں تو یہ نہیں جانتے کہ کیا کیا جائے اور کیونکر کیا جائے۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ ہر جگہ اس کا رونا ہے کہ سرمایہ نہیں۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) کے پیش نظر یہ مسئلہ ہے کہ اردو زبان و ادب کی اشاعت کے لیے ہندستان کے ہر صوبے اور علاقے میں کیونکر تنظیم کی جائے۔ چنانچہ اس غرض سے اردو زبان کے جائزے کا کام شروع کیا گیا جس کا مقصد ان امور کا معلوم کرنا ہے کہ ہر صوبے اور ہر علاقے میں کتنے اردو بولنے اور سمجھنے والے ہیں، کتنے اُردو لکھ پڑھ سکتے ہیں، کتنے ایسے ہیں جن کی مادری زبان اُردو ہے، کتنے اُردو مدارس ہیں اور اُردو پڑھنے والوں کی کیا تعداد ہے، کتنے کتب خانے ہیں، کتنے اُردو اخبار، رسالے اور مطبع ہیں، اردو نصاب تعلیم کی کیا حالت ہے، سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں اردو کا کہاں تک دخل ہے۔ کون کون لوگ اُردو سے ہمدردی رکھتے اور اردو کی خدمت کرتے ہیں غرض

اسی قسم کے اور استفسارات ہیں جن کے جواب مہیا کرنے کی کوشش کی جارہی ہی۔ ان سب کا منشا یہ ہی کہ ہم ہر صوبے اور علاقے کے مخصوص حالات پیش نظر رکھ کر وہاں کام شروع کریں۔لیکن صدر انجمن کچھ نہیں کرسکتی اگرخود ان علاقوں کے لوگ اس کی مدد نہ کریں یا اس کام میں اس کا ہاتھ نہ بٹائیں۔ انجمن کی شاخیں ہر علاقے میں اسی غرض سے قایم کی گئی ہیں اور کی جارہی ہیں۔ہر علاقے کے لوگ اپنے حالات سے زیادہ باخبر اوراپنی ضروریات سے زیادہ واقف ہوتے ہیں۔ صدر انجمن نے زبان کی اشاعت اور ترقی ادب کا خاکہ تیار کردیا ہی۔اب یہ ہر شاخ کا کام ہی کہ اس پر عمل کرنے کی کوشش کرے۔ البتہ یہ ضرور ہی کہ جب کوئی مشکل آپڑے گی یا ضرورت محسوس ہوگی تو صدر انجمن اپنی شاخوں سے تعاون کرنے اور امداد اور مشورہ دینے میں کبھی دریغ نہیں کرے گی۔

عام طور پر شاخوں کے لیے یہ کام تجویز کیا گیا ہی:-

۱ — مناسب مقامات پر اردو کے مکاتب قایم کرنا۔
۲ — بالغوں کی تعلیم کے لیے مدارس شبینہ قایم کرنا۔
۳ — لوگوں کے دلوں میں اردو زبان کی ضرورت اوراہمیت کا احساس پیدا کرنا۔
۴ — مطبوعات انجمن ترقی اُردو وغیرہ کی اشاعت میں کوشش کرنا۔
۵ — مختلف مقامات پر کتب خانے اور مطالعہ خانے قائم کرنا۔
۶ — حسب ضرورت ادبی جلسے کرنا۔
۷ — اپنے اپنے علاقے میں میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے مدارس، نیز سرکاری مدارس اور مکاتب میں اردو کی تعلیم کا انتظام کرنا۔
۸ — اپنے اپنے علاقے کے اچھے اردو لکھنے والوں کی ہمت افزائی کرنا۔

۹۔ اپنے اپنے علاقے کے سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں اُردو زبان کے رواج کی کوشش کرنا۔

۱۰۔ مقامی ضروریات کے مطابق اردو کے تحفظ و ترقی کی مناسب تدابیر اختیار کرنا۔

یہ شاخوں کے کام کا مجمل خاکہ ہے۔ اس بنیاد پر تفصیلی کام ہر ایک شاخ کو اپنے اپنے علاقے کے مخصوص حالات کے مطابق کرنا ہوگا۔

کراچی میں انجمن ترقی اُردو کی شاخ ایک مدت سے قایم ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس نے کچھ کام نہیں کیا لیکن اس زمانے کے لحاظ سے اسے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ اس کے کام کی موجودہ رفتار بالکل ناکافی ہے۔ آپ نے جس شوق سے اس کام کی ابتدا کی تھی اسے انجام تک پہنچانے کے لیے پوری کوشش اور پوری قوت اور کامل تن دہی کی ضرورت ہے۔

یوں تو ہم میں سینکڑوں اختلافات موجود ہیں لیکن غالباً زبان ہی کا مسئلہ ایسا ہے جس میں ہم سب متفق ہیں مگر اختلافات پیدا ہوتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ اس لیے آپ کو ہر قسم کے اختلافات اور مشکلات کے مقابلے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ کرنے کے قابل ایسے ہی کام ہوتے ہیں اور اسی میں انسان کے جوہر کھلتے ہیں۔

حضرات! اگر آپ کو اپنی زبان عزیز ہے اور آپ اسے قومی زبان خیال کرتے ہیں تو اس کی ترقی کے لیے ایسی ہی کوشش کیجیے جیسے آپ اپنی زندگی کے لیے کرتے ہیں کیونکہ یہ ہماری زندگی کا جز ہے اور ہمارا تمدن اور تہذیب اور معاشرت اس سے وابستہ ہے۔

اس لیے میں اپیل کرتا ہوں تمام اہل سندھ سے، میں اپیل کرتا ہوں

تمام اردو کے بہی خواہوں اور ہمدردوں سے اور اپیل کرتا ہوں ملک و قوم کے ہوا خواہوں سے اور خصوصًا مسلم ہوسٹل کے طالب علموں سے کہ وہ اپنی قومی زبان کی اشاعت و ترقی میں دل و جان سے کوشش کریں اور سب سے آخر میں اور سب سے زیادہ زور اور ادب کے ساتھ میں علمائے کرام اور مشائخان عظام کی خدمت میں درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے ارادت مندوں کو اس طرف متوجہ کریں تاکہ ان کے اثر اور ہدایت کی بدولت زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہمارے قومی اتحاد کو بھی استحکام اور ترقی نصیب ہو۔

تقریر صدارت اُردو کانفرنس صوبہ متوسط (ناگپور)

(مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب کا خطبۂ صدارت ۲۳ راکتوبر ۱۹۳۸ء)

اے صاحبو! کسی حکیم کا قول ہے کہ جس چیز کو ہم ہر وقت دیکھتے رہتے ہیں اسے کبھی نہیں دیکھتے یہی نہیں بلکہ اس کی قدر بھی نہیں کرتے۔ یہی حال زبان کا ہے ہم صبح سے شام تک اسے بولتے اور اس میں بات چیت کرتے رہتے ہیں لیکن ہم میں سے کتنے ہیں جو کبھی اس پر غور کرتے ہوں کہ یہ کیا چیز ہے اور اس میں کیسے کیسے گُن بھرے ہوئے ہیں۔ حضرات اسے معمولی چیز نہ سمجھیے یہ ایک زبردست قوت ہے اس کی پشتی پر ایک نہایت مستحکم فصیل اور قلعہ ہے۔ وہ مستحکم فصیل اور قلعہ تہذیب و تمدن ہیں جن پر ہماری معاشرت اور ہماری سیاست، ہمارے مذہب اور ہماری ترقی کا دارومدار ہے۔ اگر ہم ابتدا سے اب تک زبان کے ارتقا کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ انسانی ترقی کا راز بہت کچھ زبان میں پنہاں ہے۔ علم بڑی قوت ہے لیکن اس قوت کا سہارا زبان پر ہے۔ یہ تو ہوا عام زبان کا حال لیکن ہماری اردو زبان کی شان سب سے نرالی ہے۔ یوں تو ہندستان میں بیسیوں اور سینکڑوں زبانیں ہیں لیکن جو امتیازی خصوصیت اسے حاصل ہے وہ یہاں کی کسی زبان میں نہیں پائی جاتی۔ یہ سنسکرت کی طرح باہر سے نہیں آئی۔ یہ بنگالی، مرہٹی، اُڑیہ، ملیالم، تلنگی، تامل کی طرح کسی خاص فرقے یا کسی خاص علاقے کی زبان نہیں

بلکہ یہ سب کی زبان ہی اور سارے ملک کی زبان ہی اور اسی لیے ہمارا دعویٰ ہی کہ اگر ہندستان کی کوئی زبان ملک کی عام مشترکہ زبان ہوسکتی ہی تو یہی زبان ہوسکتی ہی۔ یہ کیوں ؟ اس لیے کہ یہ نہ باہر سے آئی نہ پہلے سے موجود تھی نہ کسی نے اسے بنایا بلکہ انسانی ضروریات اور زمانے کے اقتضا نے اسے بنایا اور قانون قدرت کی بدولت جو اٹل ہی یہ بڑھی، پھیلی اور پھلی پھولی۔ مسلمان جب اس ملک میں آئے تو یہاں نہ تو ایک حکومت تھی اور نہ ایک زبان۔ ہر علاقے کا الگ راج تھا اور ہر علاقے کی الگ زبان اور چونکہ آمد و رفت کے وسائل مہیّا نہ تھے اس لیے نہ ایک حکومت ہونے پائی اور نہ کسی ایک زبان کو ایسا فروغ ہؤا کہ وہ سارے ملک کی یا ملک کے اکثر حصے کی زبان ہوجاتی۔ مسلمانوں کی بدولت رفتہ رفتہ حکومت بھی ایک ہوگئی اور زبان بھی خود بخود ایک بن گئی۔

اردو زبان کی پیدایش ہندستان کی تاریخ کا عجیب وغریب واقعہ ہی جس پر موّرخین نے بہت کم توجہ کی ہی۔ مسلمان جب یہاں آکر بس گئے اور انھیں اپنے وطن سے کوئی تعلق نہ رہا تو فطرتی طور پر ان کا میل جول ملک کے اصل باشندوں سے بڑھنا شروع ہؤا۔ میل جول کا سب سے بڑا ذریعہ زبان ہی اگر ہم ایک دوسرے کی زبان نہ سمجھیں تو آپس میں اُنس اور الفت بھی نہیں ہوسکتی اور نہ ہمارے تعلقات میں کوئی لُطف پیدا ہوسکتا ہی اور نہ کوئی کاروبار کرسکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ مسلمانوں نے اپنی زبان میں ہندی لفظ داخل کرنے شروع کیے اور ہندوؤں نے اپنی زبان میں فارسی لفظ بولنے شروع کیے۔ اس زمانے میں دفتر فارسی میں تھے۔ دربار، سرکار امرا کی زبان فارسی تھی۔ مکتبوں اور مدرسوں میں فارسی پڑھائی جاتی تھی اور ہندو مسلمان

دونوں ایک ہی دفتر میں کام کرتے اور ایک ہی مدرسے میں ساتھ ساتھ پڑھتے۔ اکبر کے زمانے تک سلطنت کا حساب کتاب ہندی میں رکھا جاتا تھا لیکن محکمۂ حساب کے افسرِ اعلیٰ راجہ ٹوڈرمل نے احکام جاری کیے کہ آیندہ سے تمام حساب کتاب فارسی میں رکھا جائے۔ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی ہندوؤں کی بول چال تحریر تقریر میں ایسی رچ گئی کہ انھوں نے دانستہ و نادانستہ فارسی کے ہزارہا لفظ بلا تکلّف اپنی زبان میں داخل کر لیے۔یہ جو ہمیں الزام دیا جاتا ہے کہ ہم نے ہندستانی زبان میں بہت سے عربی و فارسی الفاظ بھر دیئے ہیں یہ بالکل غلط اور بہتان ہے۔عربی فارسی کے لفظوں کے داخل کرنے والے ہندو ہیں نہ کہ مسلمان۔اس کی ایک صاف مثال میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں ۔جب انگریزوں کا اس ملک پر تسلّط ہوا اور ہمارے نوجوانوں نے انگریزی پڑھنی شروع کی،انگریزی دفتروں میں ملازمت کی اور انگریزی بولنے اور لکھنے کی مشق بہم پہنچائی تو جب وہ اپنی زبان بولتے تو آدھی انگریزی اور آدھی دیسی زبان ہوتی تھی۔لیکن برخلاف اس کے جب کوئی انگریز اردو یا دیسی زبان بولتا تو یہ کوشش کرتا کہ اس کی گفتگو میں کوئی انگریزی لفظ نہ آئے۔اب جو اردو میں سینکڑوں انگریزی لفظ داخل ہو گئے ہیں تو کیا یہ انگریز نے داخل کیے ہیں ؟ یہ سب ہم نے اپنی خوشی سے داخل کیے ہیں۔یہی حال اُس وقت ہندوؤں کا تھا کہ وہ خوشی خوشی بلکہ از راہِ فخر فارسی لفظ ہندی میں ملاتے چلے گئے۔اس میں شک نہیں کہ اردو زبان پر ایک دَور ایسا آیا کہ ایک خطّے کے اہلِ زبان نے عربی فارسی لفظ دھڑا دھڑ داخل کرنے شروع کیے لیکن وہ دَور بہت تھوڑے زمانے تک رہا اور بہت جلد پھر سادہ اردو کا رواج شروع ہو گیا۔اس معاملے میں سب سے بڑا اثر سرسیّد احمد خاں کا پڑا۔اس وقت

سے ہم برابر سادہ اردو بولتے اور لکھتے ہیں۔ جب مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سلیمان ندوی جیسے عالم سلیس لکھنے لگے ہیں تو دوسروں کا کیا ذکر۔ لیکن برخلاف اس کے ہمارے ہندو بھائی اپنی ہندی میں بلا لحاظ موقع و محل سنسکرت کے غیر مانوس ثقیل اور غلیظ لفظ داخل کرتے چلے جاتے ہیں، وہ ایک ایسی نئی زبان بنا رہے ہیں جو کسی انسان کی زبان نہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اسے ہندستانی کہتے ہیں اور بقول سرتیج بہادر سپرو کے یہ لوگ ہندستانی کی آڑ میں شکار کھیل رہے ہیں اور اس زبان کو مٹانا چاہتے ہیں جو دونوں کے اتحاد اور ایک جہتی سے بنی تھی اور دونوں کی زبانوں اور دونوں کی تہذیبوں کا بہترین خلاصہ ہے گویا اپنے اسلاف کی محنت اور یادگار کو مٹا کر اتفاق کی بجائے نفاق پیدا کر رہے ہیں۔ غضب یہ ہے کہ عربی فارسی الفاظ ہی نکال کر سنسکرت نہیں داخل کر رہے ہیں بلکہ ہندی کے معمولی الفاظ جنھیں ادنیٰ اعلیٰ سب بولتے ہیں وہ بھی خارج کیے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ سنسکرت کے موٹے موٹے لفظ بھرے جا رہے ہیں۔

ابھی چند روز ہوئے مجھے معلوم ہوا کہ یو۔پی کانگریس حکومت نے ایک سرکلر شائع کیا ہے جس میں حکم دیا ہے کہ آئندہ سے مدعی کی جگہ "جھگڑو" اور مرافع یعنی اپیلانٹ کی جگہ "پلٹو"، لکھا جائے۔ کیا یہی جناتی زبان ہے جسے وہ اردو جیسی مقبول خاص و عام زبان کی قائم مقام بنانا چاہتے ہیں؟ یہ اردو کی مخالفت نہیں بلکہ اتحاد و اتفاق کی مخالفت اور سراسر ملک کی دشمنی ہے۔ خیر سے اس پر دعویٰ قومیت کا بھی ہے! آپ کے صوبے میں تو اس سے بھی زیادہ غضب ہو رہا ہے یعنے یہاں اعلام یعنی اسمائے خاص کو بھی بدلا جا رہا ہے مثلاً ہندستانی علاقے کو مہاکشل، برار کو ودھروا، ناگپور کو

ناگپشور، حکومت کو رام راج اور ایک اچھے خاصے بھلے آدمی کو مہاتما بنا دیا گیا ہے۔کیا اسی کے معنی قومیت کے ہیں؟ قومیت کا دعویٰ اور اس پر یہ لچھن! افسوس صد افسوس!

آپ کے صوبے میں قومیت کے مبارک نام سے ایک اور شگوفہ چھوڑا گیا ہے۔یہ وہ مشہور تعلیمی اسکیم ہے جس کا غلغلہ سارے ہندستان میں مچا ہوا ہے۔

ودیا مندر اسکیم پر اس قدر بحث ہو چکی ہے اور اس پر اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ اس وقت اس کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔لیکن باوجود اس کے بہت کم لوگ ہیں جو اس کے حسب و نسب سے واقف ہیں۔بظاہر آنریبل مسٹر شُکلا کو اس کی ایجاد کا فخر ہے جس پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ خشکہ باگندہ بروں اگرچہ گندہ مگر ایجاد بندہ۔لیکن یہ حقیقت نہیں۔اگرچہ یہ عام طور پر واردھا اسکیم کا بچہ کہلاتا ہے لیکن میں اپنے ذاتی علم کی بنا پر یہ کہتا ہوں کہ یہ نومولود اپنی والدہ ماجدہ سے بہت پہلے پیدا ہو چکا تھا۔اس کے حقیقی والد سیاسی مذہبی لیڈر اور ہمارے قدیم دوست پنڈت مدن موہن مالویہ اور مجازی والد اُن کے شاگرد رشید آنریبل مسٹر شُکلا ہیں۔یہ اسکیم بہت سوچ سمجھ کر بنائی گئی ہے اور اس کا جو منشا ہے وہ ظاہر ہے یعنی ہماری تعلیم، ہماری تہذیب، ہمارے تمدن اور خاص کر ہماری زبان کا مٹانا۔اس پر دعویٰ یہ ہے کہ ہم اقلیتوں کی زبان اور کلچر کے محافظ ہیں۔

یہ اپنے مدرسے کو ودیا مندر کہیں، اپنی حکومت کو رام راج کا نام دیں، معمولی اور مروّجہ ناموں کو قدیم سنسکرت ناموں سے بدل دیں تو ان کی قوم پرستی میں کوئی فرق نہ آئے اور اگر ہم کوئی سیدھی سی بات بھی

کہیں تو فرقہ پرست اور ملک کے دشمن ٹھہریں۔ گویا اس کے یہ معنی ہوئے کہ اکثریت جو کہے وہ تو قوم پرستی ہے اور اقلیت جو کہے وہ فرقہ پرستی ہے۔ اگر یہی قومیت ہے تو اس قومیت کو ہمارا دور ہی سے سلام ہے۔ یہ حضرات قومیت، جمہوریت، اکثریت اور اقلیت کے لفظوں سے کھیل رہے ہیں لیکن انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ کھیل بہت خطرناک ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے رام راج کے بانی گاندھی جی کو میری کھلی چٹھی کی طرف بڑی التجا کے ساتھ توجہ دلائی اور بہت معقول اور اچھا خط لکھا۔ لیکن وہ اس معاملے کو ایسی خوش اسلوبی سے ٹال گئے کہ مجھے بھی تعریف کرتے ہی بنی۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے عبدالحق کا خط نہیں پڑھا تم مجھ سے بہت زیادہ توقع رکھتے ہو۔

میں نے مسٹر شکلا کو لکھا ہے میری بڑی تمنا ہے کہ جب میں اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں تو لوگ مجھے صرف اس بات سے یاد رکھیں کہ میں نے اپنی ساری عمر اور محنت ہندو مسلمانوں کے ملانے میں صرف کر دی۔ سبحان اللہ کیا جواب ہے! خیر، اور کوئی یاد رکھے یا نہ رکھے ہم تو ضرور یاد رکھیں گے۔ مشکل تو یہ آ پڑی ہے کہ گاندھی جی نہ لڑنے دیتے ہیں نہ ملنے دیتے ہیں۔

حضرات! ہندی اردو کا فساد کئی بار اٹھا اور بیٹھ بیٹھ گیا۔ اگرچہ اس کے اٹھانے والے بڑے بڑے مہا پرش نہ تھے لیکن اس کو اصلی قوت اور دائمی استقلال اس وقت حاصل ہوا ہے جب ملک اور قوم کے سچے بہی خواہ گاندھی جی نے اس کا بیڑا اٹھایا۔ اس لبستی[1] بھرے شہر میں بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے اجلاس کے موقع پر گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں سے بڑا معرکہ ہوا

---

[1] ناگپور کی طرف اشارہ ہے۔

وہ ہندی کے حق میں تھے اور ہم ہندستانی کی حمایت میں۔ میں نے بہت کہا کہ آپ ہندستانی فرمایئے میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میں نے کہا کہ نیشنل کانگرس کا رزولیوشن ہے کہ ملک کی زبان ہندستانی ہوگی۔ فرمانے لگے کہ وہ رزولیوشن بھی تو میں نے ہی بنایا تھا۔ اس جلسے میں انڈین نیشنل کانگرس کے تین جیتے جاگتے پریسیڈنٹ موجود تھے جو بُت بنے بیٹھے تھے۔ ایک کے بھی مُنْہ سے نہ پھوٹا اور کسی نے میری کیا کانگریس کے رزولیوشن کی بھی تائید نہ کی۔ آخر میں حضرت مہاتما نے فرمایا کہ میں ہندی بھی نہیں چھوڑ سکتا تو میں نے کہا کہ پھر ہم اردو کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ ہم ہندی اتھوا ہندستانی کے دھوکے میں نہیں آ سکتے، ہم لفظوں کو نہیں، عمل دیکھنا چاہتے ہیں اور عمل جیسا کچھ ہو رہا ہے وہ ظاہر ہے۔ وہ عمل جراحی ہے جس میں ہماری زبان ہی نہیں ہماری تہذیب کا بھی خاتمہ کیا جارہا ہے۔

حضرات! ہم اردو نہیں چھوڑ سکتے یہ ہمارے اسلاف (ہندو مسلمان دونوں کے اسلاف) کی یک جہتی اور اتحاد کی سب سے اہم، سب سے مبارک اور سب سے عظیم الشان یادگار ہے۔ ہمارے بزرگوں نے اس کے بنانے اور سنوارنے میں محنتیں اور مشقتیں جھیلیں اور قربانیاں کی ہیں۔ اس کے ایک ایک حرف میں ان کا خون جھلکتا نظر آتا ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ ہماری تہذیب، ہماری تاریخ، ہمارے تمدن پر گواہی دے رہا ہے۔ وہ ناخلفی کریں تو کریں ہم ناخلف نہیں ہو سکتے۔ ہم اسے ہرگز نہیں چھوڑ سکتے کیونکہ یہی ایک ایسی زبان ہے جس نے ہم سب کو ایک کر دیا تھا اور یہی پھر ساری قوموں کو ایک کر سکتی ہے۔ اس کو چھوڑنا اپنی تمام عزیز یادگاروں اور عزیز چیزوں کو خیرباد کہنا اور اپنی ہستی کو فنا کر دینا ہے۔

ابھی حال میں آپ کی حکومت کے ایک وزیر باتدبیر نے اسمبلی کے بھرے اجلاس میں فرمایا تھا کہ مسلمان ایک حقیر اقلیت ہیں اور اس پر وہ ہمارے سامنے نامعقول اور بھاری بھرکم مطالبات پیش کرتے ہیں۔ یہ شخص اپنی اکثریت پر نازاں اور حکومت کے نشے میں مخمور تھا ورنہ ایسی نامعقول بات نہ کہتا لیکن اُسے سمجھ لینا چاہیے کہ اقلیت اور اکثریت کوئی چیز نہیں ہمارے سامنے فرمان خدا ہے۔

کَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً یعنے اکثر ایسا ہوا ہے اور ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے کہ اقلیتوں نے اکثریتوں کو نیچا دکھایا ہے۔ اصل چیز اقلیت یا اکثریت نہیں بلکہ ہمت و جوانمردی اور ایثار و قربانی ہے اگر ہم میں یہ جوہر ہیں تو ہم اکثریت میں ہیں ورنہ ہر حال میں ہم اقلیت میں ہیں۔ زمانہ اس کا فیصلہ بہت جلد کردے گا۔

حضرات! آپ نے جس استقلال اور ہمت و جواں مردی سے اپنی زبان کی حمایت کی ہے اس کی داد میں کیا دوں گا سارا ہندستان دے گا۔ دوسرے باتیں کرتے ہیں آپ نے کر دکھایا، دوسرے تقریریں کرتے ہیں اور آپ نے عمل کرکے بتایا۔ آپ کا یہ مسئلہ صرف سی۔پی کا مسئلہ نہیں رہا بلکہ سارے ہندستان کا مسئلہ ہوگیا ہے اور آپ کی مثال سارے ہندستان کے مسلمانوں کے لیے نظیر ہوگی۔ یہ آپ کی وقت شناسی اور مصلحت اندیشی کی دلیل ہے کہ آپ نے ایسے وقت اردو کانفرنس کا انعقاد کیا ہے۔ دنیا میں قابل قدر اور کامیاب وہی ہوئے ہیں جو وقت کو پہچانتے اور اس کے مطابق کام کرتے ہیں۔ یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ وہ مسئلہ جو سارے ہندستان کا مسئلہ ہے اور وہ زبان جس کا جنم بھوم شمالی ہند ہے اس کا فیصلہ

سی۔پی کی سرزمین میں ہو رہا ہے۔ سی۔پی اکثر اعتبارات سے سیاسی، لسانی، تعلیمی، معاشیاتی مسائل کا مرکز ہو گیا ہے۔ اور یہاں سے چند میل کے فاصلے پر براعظم ہند کے نہایت سنجیدہ اور نازک مسائل طے ہوتے ہیں اور انشاءاللہ یہیں ہمارے لسانی اور تعلیمی مسائل بھی (علی الرغم تُشکلا) طے پائیں گے اور ہم طے کر کے رہیں گے اور جب تک انصاف اور عزت کے ساتھ طے نہ ہوں گے ہم برابر جد و جہد کرتے رہیں گے اور لڑتے رہیں گے۔

دست از طلب ندارم تا کام من برآید
یا جاں رسد بہ تُشکلا یا جاں زتن برآید
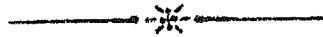
یہ تقریر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (دسمبر ۳۸ء) میں کی گئی تھی

جمیل احمد صاحب نقوی اسسٹنٹ لائبریرین یونیورسٹی نے بڑی چابک دستی سے اسے قلمبند کرلیا

جناب صدر اور صاحبو!

میری زندگی کا صرف ایک ہی مقصد ہے یعنے زبان اردو کی اشاعت اور ترقی - مجھے یا انجمن ترقی اُردو کو کسی سیاسی جماعت سے دُور کا بھی تعلق نہیں - لیکن باوجود اس کے میں ہر جماعت سے تعاون کے لیے آمادہ ہوں، بشرطیکہ اُسے ہمارے مقاصد سے ہمدردی ہو - میں جب کل یہاں حاضر ہؤا تو ڈاکٹر عابد احمد علی صاحب نے مجھے وہ اشتہار دکھایا جس میں انھوں نے اپنی طرف سے میری تقریر کے لیے ایک موضوع کا اعلان کردیا تھا - وہ موضوع ہے "موجودہ سیاست اور اردو زبان"! اسے دیکھ کر مجھے ایک موقعہ یاد آیا - جس زمانے میں کہ مسلم یونیورسٹی نہ تھی اور ایم - اے - او کالج تھا، اس وقت کالج میں ایک حجام عنایت اللہ نامی تھا - مولوی عزیز مرزا مرحوم جب تعلیم سے فارغ ہوئے تو اسے اپنے ساتھ حیدرآباد لے گئے - وہ بہت سمجھدار اور وفادار شخص تھا - اس نے حیدرآباد میں خاص حیثیت حاصل کرلی تھی اور ہم سب اُسے عزّت سے دیکھتے تھے - کچھ دنوں بعد مولوی شبلی

حیدرآباد تشریف لے گئے۔ انھیں وہی خیال رہا اور عنایت اللہ کی نئی حیثیت کی خبر نہ تھی۔ انھوں نے عنایت اللہ سے کہا کہ "میاں خلیفہ، ذرا ناخن تو لینا"، یہ اُسے ناگوار تو ضرور ہؤا مگر خیر اُن کے ناخن تو لیے مگر ایک ناخن ذرا گہرا بھی کاٹ ڈالا۔ جس سے مولوی صاحب کو ذرا جھلجھلاہٹ ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے پوچھا کہ اب تم کیا کرتے ہو۔ عنایت اللہ نے کہا کہ "مولوی صاحب اب میں پولیٹکل ہوں" اُس زمانے میں حیدرآباد کی فضا کچھ ایسی ہی تھی۔ میں جب اس زمانے کا خیال کرتا ہوں اور آج کل کے زمانے کو دیکھتا ہوں تو ہر شخص حجام یعنے پولیٹکل نظر آتا ہی۔

اس زمانے میں ہمارے ملک پر سیاسیات کا ابر چھایا ہؤا ہی اور ہماری زندگی کا کوئی شعبہ اس سے نہیں بچا۔ زبان بھی اسی لپیٹ میں آگئی ہی اور آج کل سب سے زیادہ آفت اسی پر ہی۔ اور یہ آج سے نہیں بلکہ ایک زمانے سے ہماری زبان کو سیاسیات نے گھیر رکھا ہی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سیاسی اختلاف اور نزاع کی ابتدا اِسی سے ہوئی اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہی۔

غدر سے پہلے اس کا کسی کو خیال بھی نہ تھا۔ چنانچہ جب ۱۸۳۷ء میں فارسی کی بجائے دفتروں اور عدالتوں میں اردو زبان کو رائج کیا گیا تو کسی فرو بشر نے اس کی مخالفت نہ کی اور کہیں سے یہ آواز نہ اٹھی کہ نہیں، ہندی بھاشا ہونی چاہیے۔ اردو کو سب نے تسلیم کرلیا۔ یہ نہ کرتے تو کیا کرتے، دوسری کوئی زبان تھی ہی نہیں جو اس کے مقابلے میں آتی۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد سے رفتہ رفتہ زبان کی چھیڑ شروع ہوتی ہی۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلّط اُٹھ گیا اور انگریزی حکومت قائم ہوگئی تو اُس وقت ہندوؤں کی ایک جماعت میں قومیت کا ایک نیا احساس پیدا ہؤا اور اپنی قدیم تہذیب کو پھر زندہ

کرنا چاہا - اسی زمانے میں سوامی دیانند سرسوتی نے سنسکرت کے پڑھنے پڑھانے اور بولنے پر زور دیا اور ویدک زمانے کی یاد تازہ کی، گروکل قایم کیے اور ان میں ویدک زمانے کی تہذیب اور رسوم کو از سر نو رواج دیا - اس کے بعد یورپ والوں نے اس خیال کو اور تقویت پہنچائی - خاص کر پروفیسر میکسمولر کی تحریروں اور میڈم بلوٹسکوی، اینی بسنٹ اور کرنل اسکاٹ کی تحریروں اور تحریکوں نے اور شہ دی - قومیت کے لیے لازم ہی کہ زبان بھی ایک ہو - وہ زبان وہ ہی جسے آج کل ہندی کہا جاتا ہی مگر وہ ایسی ہندی ہی جسے نہ شہر والے سمجھتے ہیں نہ دیہات والے -

غرض اس طرح زبان بھی الگ کر لینے کی کوشش کی گئی - یہیں سے اصل نزاع اور نفاق کی ابتدا ہوتی ہی - یہ پہلا قدم تھا جو فرقہ پرستی یعنی کمیونلزم کی طرف اٹھایا گیا - اور وہ فرقہ پرستی جس کے مجرم آج ہم قرار دیے جاتے ہیں اس کی بنا سب سے اول ان حضرات نے اپنے مبارک ہاتھوں سے ڈالی - سب سے پہلے اس کا بیج بہار میں بویا گیا، اس کے بعد اس کے کلّے یو-پی میں پھوٹے - بنارس اور الہ آباد میں سبھائیں قائم ہوئیں اور اس بات کی کوشش شروع ہوئی کہ عدالتوں اور دفتروں میں ہندی کو رواج دیا جائے - اُس وقت سر سید احمد خاں نے اس نامبارک تحریک کی مخالفت کی اور اردو کی تائید میں مضامین لکھے - سر سید نہایت حسرت اور افسوس سے لکھتے ہیں کہ "تیس برس کے عرصے سے مجھ کو ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، خیال پیدا ہؤا اور ہمیشہ میری یہ خواہش تھی کہ دونوں مل کر دونوں کی فلاح میں کوشش کریں مگر جب سے بعض ہندو صاحبوں کو یہ خیال پیدا ہؤا کہ اردو زبان اور فارسی کو جو مسلمانوں کی

حکومت اور ان کی شاہنشیٔ ہندستان کی باقی ماندہ نشانی ہی مٹا دیا جائے۔ اس وقت سے مجھ کو یقین ہوگیا کہ اب ہندو مسلمان باہم متفق ہوکر ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کر سکتے۔ میں نہایت درستی اور اپنے تجربے اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا ہی اس کی ابتدا اسی سے ہوئی "۔

یہ سلسلہ برابر جاری رہا، لیکن رفتہ رفتہ اس کا زور کسی قدر کم ہوگیا۔ اس کے بعد جب سر انٹونی میکڈانلڈ اس صوبے کے لفٹنٹ گورنر ہوکر آئے تو یہ شاخ جو کملا سی گئی تھی پھر ہری ہونی شروع ہوئی۔ وہ بہار سے آئے تھے اور اُردو ہندی کے جھگڑے میں بہت کچھ حصّہ لے چکے تھے۔ ان کے یہاں پہنچنے پر ہندی والوں نے پھر ریشہ دوانیاں شروع کیں۔ یہ سرسید کی زندگی کے بالکل آخری دن تھے۔ اس موقع پر بھی انھوں نے ایک مضمون لکھا جو غالباً اُن کی آخری تحریر تھی اور جس میں اُنھوں نے اس انجمن کو جو الہ آباد میں اردو کی حمایت کے لیے قایم ہوئی تھی لکھا کہ میں اس معاملے میں ہر قسم کی مدد دینے کو تیار ہوں۔ اس کے بعد ہی اُن کا انتقال ہوگیا اور ہندی والوں کی بن آئی جنھیں اپنی کوشش میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی اور دفتروں اور عدالتوں میں ہندی کا رواج ہوگیا۔

پھر ایک اور دوَر آتا ہی۔ نواب محسن الملک نے جو سرسید کے جانشین تھے، اردو کی حمایت پر کمر باندھی۔ لکھنؤ میں ایک بڑا بھاری جلسہ کیا جس میں نواب صاحب نے بہت پُرجوش اور پُرزور تقریر کی۔ اس تقریر کا یہ مصرع اب تک زبان زدِ خاص و عام ہی۔

عاشق کا جنازہ ہی ذرا دھوم سے نکلے

لیکن سر انٹونی میکڈانل اپنے حکم کی تعمیل پر تلے ہوئے تھے اور اس کی مخالفت کو اپنی ذاتی مخالفت سمجھتے تھے۔ انھوں نے نواب صاحب کو ڈرایا دھمکایا۔ سب سے بڑی دھمکی یہ تھی کہ اگر تم اس تحریک میں حصّہ لیتے رہوگے تو کالج کے سیکرٹری نہیں رہ سکتے۔ کالج کا نقصان انھیں گوارا نہ ہوا اور وہ اس دھمکی میں آگئے اور صبر کرکے بیٹھ رہے۔ اگر وہ سیکرٹری کے عہدے سے مستعفی ہوجاتے اور اپنی ساری ہمت اردو کی ترقی اور اشاعت میں صرف کردیتے تو ہماری زبان کو بڑی تقویت پہنچتی اور ہمیں یہ روزِ بد نہ دیکھنا پڑتا۔

اس کے بعد یہ معاملہ کچھ دنوں تک دھیما پڑگیا۔ اُس وقت تک ہندی میں ادب کا ذخیرہ کچھ بھی نہ تھا۔ چند معمولی کتابیں اور قصے کہانیاں تھیں، ان میں بھی اکثر اردو کے قصے تھے جو ناگری حروف میں چھاپ لیے تھے۔ لیکن جب پنڈت مالویہ نے شدھی اور سنگھٹن کا قضیہ چھیڑا تو اس سلسلے میں ہندی زبان بھی آگئی۔ اور اس مذہبی جوش میں ہندی زبان کو خوب فروغ ہوا۔ اب یہ ادبی چیز نہ رہی بلکہ سیاسی اور مذہبی ہوگئی۔ اور چونکہ وہ اپنی الگ ایک سیاسی جماعت اور نئی قومیت بنا رہے تھے اس لیے اس پردے میں زبان کی ترقی ضرور ہوگئی۔

اس میں شک نہیں کہ پنڈت جی کی تحریک سے ہندی زبان کو بہت تقویت پہنچی اور خود انھوں نے اور اُن کے ہم خیال اصحاب نے کوشش کرکے یہ نئی زبان بولنی اور لکھنی شروع کردی اور ہندی ادب میں بھی اس کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا گیا لیکن سب سے بڑی قوت اِسے اُس وقت پہنچی جب گاندھی جی نے ساہتیہ سمیلن کی صدارت قبول کی اور ہندی کو ہندستان کی عام زبان بنانے کا بیڑا اٹھایا۔ اس سے سارے ملک میں ایک سرے

سے دوسرے سرے تک ہندی کا غلغلہ مچ گیا۔ اور صوبہ مدراس، پنجاب اور سرحد جیسے علاقوں میں جہاں کی زبانوں سے ہندی کا کوئی تعلق نہ تھا، ہندی تیزی سے پھیلنی شروع ہوگئی۔ اور وہاں کے ہندو اپنی اپنی حکومتوں سے ہندی کی تعلیم کا مطالبہ کرنے لگے جو بالکل ناواجب تھا، کیونکہ ہندی نہ کبھی وہاں کی زبان تھی اور نہ اب ہے۔ یہاں تک کہ اس جوش میں انڈین نیشنل کانگریس کا رزولیوشن بھی پسِ پُشت ڈال دیا گیا۔ اور اس کی اشاعت میں لاکھوں رُپے صرف کیے جا رہے ہیں۔ ایک طرف تو یہ دعویٰ ہے کہ ہم ہندستان میں ایک قوم بنانا چاہتے ہیں اور اس قومیت کے دعوے کے ساتھ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ملک میں بول چال کی ایک زبان ہو اور وہ زبان ایسی ہو جو مشترک ہو اور دوسری طرف اُس زبان کو جو مشترک ہے اور دونوں قوموں کی یک جہتی اور اتحاد سے بنی ہے اُسے خارج بھی کرنا چاہتے ہیں۔

ہندستان میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن وہ زبان جو بہت پہلے سے مشترک چلی آتی ہے یعنے اردو زبان اس کی حیثیت دوسری زبانوں سے بالکل جُدا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ کسی خاص علاقے، قوم یا ذات میں محدود نہیں۔ ہندستان کے ہر علاقے میں کچھ نہ کچھ سمجھی اور بولی جاتی ہے اور اکثر علاقوں میں لکھی پڑھی جاتی ہے اور اس لیے دوسری زبانوں کے مقابلے میں اُسے ہر لحاظ سے مشترک ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ حیثیت دوسری زبانوں کو حاصل نہیں۔ یہ اُس تمدن اور تہذیب کی یادگار ہے جو ہندو مسلمانوں کے ربط ضبط سے پیدا ہوئی۔ یہ زبان خاص ہندستان کی ہے اور دو قوموں کی تہذیب کی عظیم الشان یادگار ہے اور اس لیے اس پر دونوں کو مساوی حق حاصل ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے اس زبان کو رواج دینے میں کوشش کی

سراسر بہتان ہے۔ مسلمان بادشاہوں کو کبھی توفیق نہ ہوئی کہ وہ اس طرف توجہ کریں۔ اور ایک بادشاہ ہی نہیں، ہمارے علما اور فضلا بھی اس کی طرف سے بے پروا رہے۔ بلکہ اسے حقارت سے دیکھتے تھے۔

یہ زبان نہ کسی بادشاہ کے خبط کا نتیجہ ہے نہ کسی حکیم کی حکمت کا نہ کسی کانگرس یا کانفرنس کے رزولیوشنوں سے پیدا ہوئی نہ کسی مہاتما کے روحانی فیض سے اور نہ کسی مفتی کے فتوے سے، بلکہ اسے قدرتی اور معاشرتی ضرورت نے پیدا کیا اور یہ سراسر زمانے کا اقتضا تھا، اس لیے کہ جب مسلمان یہاں آئے تو یہاں نہ کوئی ایک حکومت تھی نہ کوئی ایک زبان۔ ہر علاقے میں مختلف بولیاں بولی جاتی تھیں، ہر جگہ انتشار اور ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ جب مسلمانوں کی حکومت کو ذرا استقلال ہؤا تو اس زبان نے بھی فروغ پایا اور جیسے جیسے اس کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور جہاں جہاں اس کے صوبے دار اور لشکر اور لشکری پہنچے یہ بھی اُن کے ساتھ پہنچی۔

اس زبان کا ملک پر بڑا احسان ہے اور وہ یہ کہ اس نے مختلف لوگوں اور قوموں کو ایک کر دیا۔ جہاں نفاق و انتشار تھا وہاں اتفاق و نظام پیدا کر دیا اور ایک نئی تہذیب کی بنیاد ڈالی جس نے سب کو ایک رنگ میں رنگ دیا۔ یہ اس کا کچھ کم احسان نہیں۔ یہ زبان ہر حیثیت سے مشترک ہے اور بقول سر تیج بہادر سپرو کے "جائداد مشترکہ ناقابل تقسیم ہے"

یہ زبان جیسا کہ میں نے عرض کیا مخلوط زبان ہے۔ اور مخلوط زبان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں طرفین کو کچھ نہ کچھ قربانی کرنی پڑتی ہے۔ جب دو مختلف زبانوں کے بولنے والے ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں تو ہر ایک کو اپنی زبان کی بعض ایسی خصوصیتیں ترک کرنی پڑتی ہیں

جو اُس زبان سے مخصوص ہیں اور جس کے سمجھنے یا قدر کرنے سے غیر زبان والا قاصر ہوتا ہے۔ اس لیے دونوں زبان والے ایک دوسرے کی خاطر اپنی بعض خصوصیتوں اور لفظی نزاکتوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک روز سرسید مسٹر بیک سے گفتگو کر رہے تھے تو اثنائے گفتگو میں فرمانے لگے "ہی ڈِڈ وِد ضد ناٹ وِد دِل" (He did with zid not with dil)

مسٹر بیک بھی اسی طرح کی مخلوط زبان میں اپنی اُردو بگھار رہے تھے۔ میں نے جب یہ گفتگو سنی تو میرا خیال فوراً اُردو زبان کی پیدائش کی طرف گیا۔ جب ہندو مسلمان آپس میں ملے ہوں گے اور انھوں نے آپس میں بات چیت کی ہوگی تو ان کی گفتگو کا ڈھنگ بھی یہی ہوگا اور ان کے متواتر میل جول سے رفتہ رفتہ نئی زبان بن گئی ہوگی۔ اور اس میں مطلق شبہ نہیں کہ وہ اسی طرح سے وجود میں آئی۔ غرض اُردو زبان دونوں زبانوں (یعنے دیسی اور بدیسی زبانوں) اور دونوں قوموں (یعنے ہندو مسلمانوں) کی قربانی سے پیدا ہوئی ہے۔ جو چیز ایسی قربانی کے بعد حاصل ہوئی ہو وہ کیوں کر عزیز نہ ہوگی؟ ہم ہندو مسلمانوں نے قربانیاں کرکے یہ زبان بنائی ہے، پھر کس کا منہ ہے جو اس کی مخالفت کرے؟ جو اس کی مخالفت کرتا ہے وہ اپنے ملک اور قوم کی مخالفت کرتا ہے۔

اس کے بنانے، بڑھانے، سنوارنے اور فروغ دینے میں ہندو مسلمان دونوں کی کوشش شریک ہے۔ ہمارے اسلاف نے صدہا سال اس پر محنت کی ہے، تب جاکر اس نے یہ رنگ روپ نکالا ہے۔ اب جو کوئی اس کی مخالفت کرتا ہے وہ کپوت ہے، ناخلف ہے، ناسعادت مند ہے۔

اب اس اختلاف کا یہ سلسلہ جس کی ابتدا سیاسی اختلاف سے ہوئی

اور جس میں مذہبی جوش بھی شریک تھا، بڑھتا چلا۔ جب انڈین نیشنل کانگرس نے یہ دیکھا کہ دونوں فریق مخالفت پر تُلے ہوئے ہیں تو اس نے کچھ اپنی مصلحت اور کچھ رفع شر کے خیال سے یہ کیا کہ ہندی اور اردو دونوں لفظ ترک کر دیے اور اُن کی جگہ ہندستانی کا لفظ اختیار کیا اور اسی کو ملک کی زبان قرار دیا۔ مگر اس نے یہ نہیں بتایا کہ ہندستانی کسے کہتے ہیں۔ شاید یہ اچھا ہی ہوا ورنہ یہ جھگڑا اور طول پکڑتا۔

لیکن بڑا معرکہ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے اجلاس میں ہوا۔ بحث یہ تھی کہ پرشد کی کاروباری زبان کیا ہو۔ گاندھی جی فرماتے تھے ہندی اور میں کہتا تھا ہندستانی۔ میری دلیل یہ تھی کہ جب انڈین نیشنل کانگرس نے ہندستانی کے متعلق فیصلہ کر دیا ہے تو اسے ماننے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ گاندھی جی نے فرمایا کہ وہ رزولیوشن بھی تو میرا ہی بنایا ہوا تھا۔ میں نے کہا اس وقت تو اس کا یہ مطلب نہ تھا۔ فرمایا کہ میں اب بتاتا ہوں۔ میں حیرت سے اُن کا منہ تکنے لگا۔ اگر ہر دس بارہ برس بعد مفہوم بدلنے لگے تو پھر کوئی فیصلہ قابل اعتبار نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد انھوں نے "ہندی ہندستانی" کا نیا لفظ گھڑا۔ میں نے دریافت کیا کہ آپ کی ہندی سے کیا مراد ہے۔ کہنے لگے وہ زبان جو کتابوں میں ہے، بول چال میں نہیں۔ اور ہندستانی وہ زبان ہے جو بول چال میں ہے کتابوں میں نہیں۔ اس پر میں نے پوچھا کہ پھر "ہندی ہندستانی" کیا ہوئی۔ فرمایا کہ وہ ہندی جو آگے چل کر ہندستانی ہو جائے گی۔ میں نے کہا کہ جب ہندستانی پہلے سے موجود ہے تو اس طول عمل کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سب بحث میں لکھ چکا ہوں اور آپ کو معلوم ہے اُسے دُہرانا نہیں چاہتا۔ آخر زچ ہو کر انھوں نے یہ فرمایا کہ میں ہندی نہیں چھوڑ سکتا۔ اور

فیصلہ ووٹ لے کر کر دیا ۔ اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ جب گاندھی جی ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم اردو کیسے چھوڑ دیں ۔

اس کے بعد سے ہماری آنکھیں کھلیں ۔ ہندی اردو کی بحث روز بروز نازک ہوتی جاتی ہے ۔ جب ہماری طرف سے یہ اعتراض ہوتا ہے کہ ہندی یا ہندستانی میں کثرت سے سنسکرت لفظ ملائے جا رہے ہیں تو اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اردو میں بھی عربی فارسی الفاظ شامل کیے جا رہے ہیں ۔ لیکن اس میں اور اُس میں بہت فرق ہے ۔ ہم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ اُردو میں عربی فارسی الفاظ ملائے جائیں ۔ برخلاف اس کے گاندھی جی ، بابو راجندر پرشاد ، کاکا کالیلکر اور ان کے رفیقوں نے صاف طور پر اپنی اس پالیسی کا اعلان کیا ہے کہ سنسکرت لفظ زیادہ ملائے جائیں ۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ ہمارا منشا اس سے یہ ہے کہ جنوبی ہند والے اس زبان کو سمجھ سکیں کیونکہ ان کی زبان میں زیادہ سنسکرت کے لفظ ہیں ۔ اول یہ صحیح نہیں کہ اُن کی عام زبان میں سنسکرت زیادہ ہے ۔ دوسرے، بڑے لُطف کی بات یہ ہے کہ جنوبی ہند والے اسی وجہ سے ان سے بدگمان اور ان کے مخالف ہیں کہ اُن کو سنسکرت آمیز ہندی پڑھائی جاتی ہے ۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ " یہ لوگ بڑے مکّار ہیں ۔ یہ ہندی کے نام سے ہمارے ملک میں سنسکرت پھیلانا چاہتے ہیں اور ہماری زبان اور کلچر کو مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں "۔ اس حالت میں ان کی یہ دلیل کیسے قابل قبول ہو سکتی ہے ۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی ہند والوں کی بدگمانی کچھ بیجا نہیں ۔ جس دلیل سے وہ ہمیں پھُسلانا چاہتے ہیں وہ اُن کے مخالف پڑتی ہے ۔

اعتراض صرف یہی نہیں ہے کہ نئے نئے غیر مانوس اور ثقیل سنسکرت لفظ

داخل کیے جا رہے ہیں، بڑا غضب یہ ہے کہ جو لفظ سالہا سال بلکہ صدہا سال سے زبان میں رائج ہیں انھیں بھی خارج کیا جا رہا ہے۔ اور اس سے بھی بڑا غضب یہ ہے کہ ٹھیٹ عام فہم ہندی لفظ بھی مردود قرار دیے گئے ہیں اور ان کی جگہ یا تو اصل سنسکرت کا یا کوئی نیا غیر مانوس لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظ جب ایک بار زبان میں آگیا اور رائج ہو گیا تو وہ ہمارا ہو جاتا ہے، غیر نہیں رہتا۔ اسے غیر سمجھ کر نکالنا سخت بیدردی ہے۔ وہ اب جائے تو کہاں جائے۔ اپنے اصل وطن کو جا نہیں سکتا کیونکہ اس کا رنگ روپ خصلت سیرت سب بدل گئی ہے وہاں اسے کوئی نہیں پہچانتا۔ یہ فعل ایسا ہی سفّاکانہ ہے جیسا ہٹلر کا بے گناہ یہودیوں کو خارج کرنا۔ مثلاً برس کا لفظ ہے جسے عام و خاص، پڑھا لکھا ان پڑھ، شہری دیہاتی سبھی بولتے ہیں۔ اب اگر اُسے زبان سے نکال باہر کردیں اور اس کی جگہ اصل سنسکرت ورش استعمال کرنے لگیں تو یہ بے چارہ کہاں جائے۔ سنسکرت میں یہ داخل نہیں ہو سکتا، عربی، فارسی والے مُنہ نہیں لگائیں گے تو پھر یہ کہاں جائے۔ یہ تو ہمارا لفظ ہے اور اس کا ٹھکانا ہماری ہی زبان میں ہے، ہمیں اس کے نکالنے کا کیا حق ہے۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ آخر برس کے لفظ میں کیا بُرائی ہے، یہ کیوں مردود قرار دیا گیا ہے اور ورش میں کیا خوبی ہے جو اس کی جگہ لاکر بٹھایا گیا ہے؟ برس کو ہر اعتبار سے ترجیح ہے۔ ایک تو اس لیے کہ صدہا سال سے رائج ہے اور ہر ایک کی زبان پر ہے۔ دوسرے وہ ہمارا لفظ ہے۔ ورش ہمارا لفظ نہیں، بالکل اجنبی اور غیر ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اپنے پر غیر کو ترجیح دی جائے۔ مشترک الفاظ کو خارج کرکے مشترک زبان بنانا ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ لفظ کا معیار رواج ہے اور یہی اس کے مستند ہونے کی سند ہے۔ مثلاً مدعی اور مدعیٰ علیہ

ایسے لفظ ہیں جنھیں ایک گنوار سا گنوار بھی سمجھتا ہے اب جو انھیں ہٹا کر "بادی"
اور "پرتبادی"، کے نامانوس الفاظ کو ٹھونسنے کی کوشش کی جارہی ہے تو یہ مشترک
زبان کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہے۔ Bombay ... Times

اردو میں سرسید کے زمانے سے آسان زبان لکھنے کا عام رواج ہوگیا ہے،
اس میں شک نہیں کہ بعض مستثنیٰ بھی ہیں۔ اور یہ ہر زبان میں ہوتا ہے۔ یا بعض
علمی مضمون ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے ادا کرنے میں زبان مشکل ہو جاتی ہے۔
لیکن عام طور پر رجحان سہل زبان لکھنے کی طرف ہے۔ انتہا ہے کہ مولانا ابوالکلام
آزاد مشہور الہلال کے اڈیٹر جن کی تحریر عربی اور فارسی کے پروں پر پرواز کرتی
تھی، عامیانہ زبان پر اُتر آئے ہیں۔ اب ان کی گفتگو میں بیٹھک، چناؤ جیسے
لفظ سُن کر حیرت ہوتی ہے۔ اُردو داں طبقے نے کبھی خاص ارادے اور اہتمام سے
نامانوس عربی فارسی الفاظ زبان میں داخل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بیشک
ایک زمانہ ایسا گزرا ہے کہ لوگ مقفیٰ اور مسجع عبارتیں لکھتے تھے جن میں عربی
فارسی الفاظ کثرت سے آتے تھے لیکن وہ ایک عارضی جنون تھا۔ اب کوئی
ایسی عبارت نہیں لکھتا۔ اگر لکھے تو لوگ اس کی ہنسی اُڑائیں گے۔

ہمارے ملک میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے اور جہالت بہت
زیادہ ہے۔ انھیں پڑھنا لکھنا سکھا دیجیے اور پڑھنے کا شوق پیدا کر دیجیے،
بہت سی مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ اور آج جو چیزیں انھیں مشکل معلوم
ہوتی ہیں کل آسان معلوم ہونے لگیں گی۔

کہا جاتا ہے کہ یہ نیا زمانہ ہے، حالات بھی بہت کچھ بدل گئے ہیں اور نئے
خیالات کی رَو بڑھتی چلی آرہی ہے، اس لیے نئے الفاظ کا آنا ناگزیر ہے۔ ہم
اسے تسلیم کرتے ہیں کہ ایک زندہ زبان کے لیے لازم ہے کہ اس میں نئے الفاظ

کا اضافہ ہوتا رہی ورنہ وہ ایک روز مُردہ ہو جائے گی ۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ لغات میں سے بھدّے ، بے ڈھنگے اور ثقیل الفاظ چُن چُن کر بھر دیے جائیں ۔ ہر زبان کی ایک فطرت اور ساخت ہوتی ہی اور جب تک لفظ اس کے سانچے میں نہیں ڈھلتا ، قابل قبول نہیں ہوتا ۔ ابھی حال میں آپ کے صوبے کے وزیر تعلیم کی ایک تقریر سرکاری طور پر چھپ کر شایع ہوئی تھی اُسے دیکھ کر یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ انسانوں کی زبان ہی بلکہ یہ گمان ہوتا ہی کہ یہ شاید راکشسوں کی بولی ہی ۔ یہ زبان کا بنانا نہیں، بگاڑنا ہی ۔

یہ جو بار بار کہا جاتا ہی کہ آسان لکھو ، یہ ذرا تفصیل طلب ہی ۔ ہر زبان میں آسان لکھنے والے بھی ہوتے ہیں اور مشکل لکھنے والے بھی ۔ ایک تو اپنا اپنا طرزِ بیان ہوتا ہی اور دوسرے مضمون کی نوعیت ۔ طرزِ بیان کے معاملے میں کسی کو مجبور نہیں کر سکتے ۔ مضمون کی نوعیت کا مسئلہ اور بھی ٹیڑھا ہی ۔ سائنس ، فلسفہ ، شعر وغیرہ ایسی چیزیں ہیں کہ ان میں اِشکال آہی جاتا ہی ۔ البتہ بچوں ، لڑکوں لڑکیوں اور عام لوگوں کے لیے جو کتابیں لکھی جائیں وہ ضرور آسان اور سلیس زبان میں ہونی چاہییں ۔ اس بارے میں لوگ الفاظ پر زور دیتے ہیں کہ غیر مانوس اور ثقیل لفظ نہ ہوں ۔ اِشکال غیر مانوس لفظوں سے اتنا نہیں پیدا ہوتا جتنا پیچیدہ اور مغلّق بیان سے ۔ اس سے زیادہ زور اس بات پر دینا چاہیے کہ بیان سادہ اور سہل ہو ، رہا لفظ ، تو اس کا پرکھنے والا ادیب ہی ہو سکتا ہی ۔ وہ ہر لفظ کی نبض پہچانتا ہی اور خوب سمجھتا ہی کہ کونسا لفظ کہاں آنا چاہیے ۔ اس میں موقع اور محل کو پہچاننا بڑی بات ہی ۔ یہ انشا پردازی کا بڑا گُر ہی ۔ لفظ میں ایک جادو ہوتا ہی جو بے محل استعمال سے پھیکا پڑ جاتا ہی اور اچھا خاصا لفظ بے جان اور بے اثر

ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری آواز زیادہ سے زیادہ اشخاص تک پہنچے تو ہمیں ایسی زبان میں لکھنا یا بولنا چاہیے جسے زیادہ سے زیادہ اشخاص سمجھ سکیں۔ اور اگر ساتھ ہی آپ یہ بھی چاہتے ہیں کہ آپ کی تحریر و تقریر میں اثر اور دل کشی بھی ہو تو اس کے لیے بڑی محنت، مشق اور مطالعہ کی ضرورت ہے ورنہ نری سادہ زبان زیادہ کارآمد نہیں ہو سکتی۔

میں اس موقع پر دو ایسی غلط فہمیوں کو بھی رفع کرنا چاہتا ہوں جو ہم لوگوں میں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ ہم اُردو دانوں کو بڑا غرّہ ہے کہ اُردو زبان میں آگے بڑھنے اور پھیلنے کی فطری صلاحیت موجود ہے۔ وہ گزشتہ زمانہ میں بغیر کسی خاص کوشش کے خود بخود پھیلتی چلی گئی اور اسی طرح آئندہ بھی پھیلتی اور ترقی کرتی چلی جائے گی۔ اس میں مطلق شبہ نہیں کہ اُردو میں یہ فطری صلاحیت موجود ہے لیکن اگر فطرت کو انسانی سعی کی مدد نہ ملے تو فطری صلاحیت بھی ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے۔ اور اکثر اوقات ایسی چیزیں خودرو پودوں کی طرح پامال ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس لیے فطری صلاحیت کو اُبھارنے اور ترقی دینے کے لیے آپ کی کوشش پیہم اور متواتر جاری رہنی چاہیے۔ دوسرا ایک یہ خیال بارہا سننے میں آیا ہے کہ زبان قدرتی چیز ہے اور بنانے سے نہیں بنتی۔ اس دھوکے میں نہ رہیے گا۔ انسانی کوشش بڑی بد بلا ہے۔ یہ ہر مشکل پر غالب آسکتی ہے۔ اگر وہ لوگ جو نئی سنسکرت آمیز ہندی کے حامی ہیں عزم و استقلال سے کوشش کرتے رہے تو یاد رکھیے کہ وہی زبان جسے آپ حقارت سے دیکھتے ہیں اور جس پر ہنستے ہیں، ایک روز کامیاب ہو کر رہے گی۔

حضرات! علی گڑھ نے اردو زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔ سرسیّد احمد خاں

اور اُن کے اثر سے اُن کے رفقانے اسے ادبی اور علمی رُتبے تک پہنچانے اور اسے مقبول بنانے میں نہایت قابل قدر کام کیا ہے۔ سرسیّد کا یہ بہت بڑا احسان ہے۔ اب آپ اس کے وارث ہیں - یہ زبان ایک بڑی دولت ہے جو اسلاف ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں - انھوں نے اس کے لیے بڑی بڑی جانفشانیاں اور قربانیاں کی ہیں اور اپنے خون جگر سے اسے سینچا ہے - اب یہ ہم تک پہنچی ہے اور بے مشقت اور مفت ہم تک پہنچی ہے - ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے - اور ہمارا یہ فرض ہونا چاہیے کہ ہم موجودہ حالات کی رو سے اِسے اور ترقی دیں اور اِس دولت میں اضافہ کریں تاکہ جب یہ آیندہ نسلوں تک پہنچے تو آپ کو اسی شکرگزاری سے یاد کریں جیسے اب ہم اپنے اسلاف کا ذکر کرتے ہیں۔ آپ آیندہ نسلوں کے سامنے جواب دہ ہیں - اگر آپ نے اپنے فرض میں کوتاہی کی تو میرے کہنے کی ضرورت نہیں، آپ خود سمجھ جائیے کہ وہ آپ کو کن الفاظ سے یاد کریں گے اور آپ کے حق میں کیا کہیں گے -

لیکن افسوس یہ ہے کہ ہماری طبیعتیں ہنگامہ پسند واقع ہوئی ہیں - ہم جلسے، مشاعرے، کانفرنسیں بڑی شان سے کرتے ہیں، تجویزیں بھی بڑی آب وتاب سے پیش کرتے ہیں، بحثیں بھی بڑے جوش وخروش سے ہوتی ہیں، لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو نہ معلوم وہ جوش وخروش کیوں ٹھنڈا پڑجاتا ہے۔ مجھے علی گڑھ کے طالب علموں سے یہ توقع ہے کہ وہ دھوم دھام کم اور کام زیادہ کریں گے اور اس یونیورسٹی کے بانی کی نظیر کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھیں گے - اور جس خلوص، تندہی اور استقلال سے اُس نے اِس زبان کے رُتبے کو بڑھایا آپ بھی اُسی طرح اس کے بنانے، بڑھانے اور سنوارنے میں کوشش کریں گے کیونکہ اس کی سلامتی میں ہماری سلامتی

اور اس کے بگاڑ میں ہمارا بگاڑ ہے۔

ہندستانی کیا ہی؟[1]

(یہ تقریر ۲۱ رفروری ۱۹۳۹ء کو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے نشر کی گئی)

ہندستانی کا لفظ آج کل بھڑوں کا چھتا بنا ہوا ہی اب آل انڈیا ریڈیو سٹیشن نے اس چھتّے کو چھیڑا ہی تو اسے ڈنک سہنے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔

زبان کے معنوں میں ہندستانی کا لفظ ہمارے کسی مستند شاعر یا ادیب یا اہل زبان نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ یہ یورپ والوں کی اُپج ہی۔ یورپ کے سیّاحوں نے جو سترھویں صدی سے اس مُلک میں آنے شروع ہوئے اُس زبان کو جو شمالی ہند میں عام طور سے بولی جاتی تھی، اندستان، اندستانی اور بعد ازاں ہندستانی کے نام سے موسوم کیا۔ لیکن اس لفظ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں اُس وقت فروغ ہوا جب ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔

عجب بات یہ ہی کہ کالج کے انگریز استاد تو اُس زبان کو جس میں میر امّن کی "باغ و بہار"، شیر علی افسوس کی "آرایش محفل"، حیدری کا "طوطی نامہ"، طپش کی "بہار دانش" وغیرہ لکھی گئیں، ہندستانی کہتے ہیں لیکن ان کتابوں کے لکھنے والے اپنی کتابوں کی زبان کو اُردوے معلّی، ریختہ یا ہندی کہتے ہیں مثلاً میر امّن نے اپنی کتاب "باغ و بہار یا قصہ چہار درویش" کو ایک عرضی کے ساتھ پیش کیا۔ جس میں وہ لکھتے ہیں کہ "اُردوے معلّی کی زبان میں بلاغ و بہار بنایا"، اسی عرضی کے آخر میں یہ شعر ہی۔

---

[1] بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو، دہلی۔

سو اُردو کی آراستہ کر زباں
کیا میں نے بنگالا ہندوستاں

اس کتاب کے دیباچے میں زبان کی تاریخ بیان کرتے وقت یہ لکھتے ہیں
"حقیقت اُردو زبان کی بزرگوں کے مُنہ سے یوں سنی"

میر شیر علی افسوس "آرائش محفل" میں لکھتے ہیں کہ "اس کے تمام مطالب کو اُردو زبان میں لکھنا شروع کیا۔ مرزا طپش "شمس البیان" میں اپنی زبان کو روزمرہ فصحائے اُردوئے معلی کہتے ہیں اور اپنی بہار دانش ہندی میں اس زبان کو ایک ہی شعر کے مصرع میں تو ہندی زبان اور دوسرے میں اُردو لکھا ہے۔

شرف اُس نے ہندی زباں کو دیا
دیا نظم اُردو کو یہ مرتبا

اور چند اشعار کے بعد اسے ریختہ کہتے ہیں۔

وقایق میں ہے ریختے کے نام

حیدر بخش حیدری "قصۂ حاتم طائی" کی زبان کو ریختہ کہتا ہے۔ میر امن "گنج خوبی" میں گلکرائسٹ کو "اُردو کا قدردان" لکھتا ہے۔ مہر چند کھتری لاہوری اپنی کتاب "نو آئین ہندی" میں لکھتا ہے کہ اس نے قصۂ آذرشاہ اور "سمن رُخ" کو فارسی سے ہندی میں ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر جان گلکرائسٹ اپنی تصانیف میں ہندستانی اور اُردو دونوں لفظ اس ایک زبان کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ گارساں دتاسی کا بھی یہی حال ہے لیکن وہ زیادہ تر ہندستانی کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ بابو شیو پرشاد نے بھی "جام جہاں نما" کی زبان کو اُردو بتایا ہے۔ کلکتہ بیپٹسٹ مشن نے جو انجیل مقدس کا ترجمہ چھاپا تھا اس کے سرورق پر لکھا ہے "یونانی زبان سے اُردو زبان میں ترجمہ کیا گیا" لیکن اس کے نیچے انگریزی زبان میں In the Hindustani Language

لکھا ہی۔ بابو کاشی ناتھ بسواس کرانی اپنی کتاب قصّۂ سوہن مسمّٰی بہ گلدستۂ انجمن کے سرورق پر لکھتے ہیں "انگریزی زبان سے اُردو میں ترجمہ کیا" ڈاکٹر ای۔ سجے لارنس "رابن سن کروسو" کے ترجمے اور مسٹر جیمس کورکورن اپنی "تاریخ چین" اور ڈاکٹر فریڈرک جان اپنی اصول تشریح" کی زبان کو اُردو ہی کہتے ہیں۔ اسی طرح دہلی کالج، علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی مرزاپور سیریز کی جتنی کتابیں چھپیں اُن سب پر اُردو ہی کا لفظ لکھا ہی۔

غرض وہ تمام کتابیں جن کے نام میں نے لیے ہیں اُسی زبان میں ہیں جسے آج کل اُردو کہتے ہیں۔ انگریز اسے ہندستانی کہتے تھے۔ ہندستانی سے ان کی مراد وہ صاف اور فصیح زبان تھی جو بول چال میں آتی تھی۔ یعنی ایسی زبان جو مقفّیٰ اور پُرتکلّف نہ ہو جس کا رواج اس زمانے کی بعض کتابوں میں پایا جاتا تھا۔ اُردو، ریختہ، ہندی اُس زمانے میں ہم معنی لفظ تھے۔ چنانچہ مرزاجان طپش نے اپنی کتاب "شمس البیان" میں ہندی کی تعریف ان الفاظ میں کی ہی "ہندی عبارت از زبانِ موزونِ دہلی است"، یعنی ہندی سے مُراد دلّی کی فصیح زبان ہی۔ جدید ہندی جس کی اشاعت کی آج کل کوشش کی جارہی ہی نئے زمانے کی پیداوار ہی۔ اس نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں جنم لیا۔ در اصل یہ اُردو کا بچّہ ہی وہ اس طرح کہ عربی فارسی کے لفظ نکال کر اُن کی جگہ سنسکرت لفظ بیٹھا دیے تھے۔ مختصر یہ کہ ہمارا ادب، ہندستانی کے لفظ سے خالی ہی۔ اُردو کے کسی مستند اہل زبان اور غالبًا ہندی کے اہل زبان نے بھی اس لفظ کو زبان کے معنوں میں کبھی استعمال نہیں کیا۔

جب اس زمانے میں ہندی اُردو کے جھگڑے نے زور پکڑا اور دونوں فریق ایک دوسرے کی مخالفت پر تلے ہوئے تھے تو انڈین نیشنل کانگریس نے رفع شر کے

خیال سے ہندستانی کا لفظ اختیار کیا اور اس کو ہندستان کی عام زبان قرار دیا لیکن کانگریس نے اس کی کوئی تعریف نہیں کی اور نہ یہ بتایا کہ اس سے کیا مطلب ہے۔ وہ شاید اس جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتی تھی اور یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ آج کل سیاسی لوگوں نے جہاں اور چیزوں کو سیاست میں سان لیا ہے، غریب زبان بھی ان کی نظرِ کرم فرما کا شکار بن گئی ہے۔

اب سوچ بچار کے بعد ہندستانی کے یہ معنی قرار پائے ہیں کہ وہ زبان جو شمالی ہند میں عام طور پر بولی جاتی ہے اور جو ثقیل اور نامانوس سنسکرت اور عربی فارسی الفاظ سے پاک ہے۔ اصل میں ہندستانی کی یہ تعریف ڈاکٹر گریرسن کے بیان سے لی گئی ہے اور اس تعریف کو اکثر اُن لوگوں نے قبول کر لیا ہے جو ہندستانی کے حامی ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ حقیقت میں یہ کوئی زبان ہے بھی؟ اگر اس سے مُراد وہ زبان ہے جسے اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے انگریز ہندستانی کہتے تھے اور ہمارے اُس وقت کے ادیب ریختہ، ہندی اور اُردو سے موسوم کرتے تھے تو بے شک یہ ایک زبان ہے اور اب بھی ہندستان میں بولی اور لکھی پڑھی جاتی ہے۔ اور اگر اس سے مُراد وہ زبان ہے جو آج کل بعض جدّت پسند حضرات نے گھڑنی اور ڈھالنی شروع کی ہے تو وہ ہمارے ملک کی زبان نہیں ہے۔ اور اگر اس سے مُراد وہ زبان لی جائے جو دونوں ہندی اُردو بولنے والوں میں مقبول ہو تو وہ ابھی وجود میں نہیں آئی ہے۔ بول چال کی زبان کی حد تک تو ٹھیک ہے، لیکن جہاں ادب کی سرحد آتی ہے تو وہ رہ جاتی ہے۔ گاندھی جی نے ہندی، ہندستانی کا لفظ ایجاد کیا تھا۔ چونکہ بے جوڑ تھا، مقبول نہ ہوا۔ نتیجہ یہ کہ آسان اُردو کا نام ہندستانی ہوا۔ آپ فرمائیں گے کہ آسان ہندی کو ہندستانی کیوں نہ کہیں؟ ضرور کہیے، کیونکہ جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں، جدید ہندی اُردو ہی کا تو بچہ ہے

رہی یہ بات کہ زبان سادہ اور آسان ہو تو بول چال میں تو عموماً سادہ ہی ہوتی ہی۔ جب بچوں یا معمولی پڑھے لکھوں کے لیے کوئی کتاب یا قصّے کہانیاں لکھی جاتی ہیں تو بھی زبان سادہ رکھنی پڑتی ہی۔ یہ کچھ ہماری عادت پر موقوف نہیں، دُنیا کی سب زبانوں کا یہی حال ہی۔ مگر جب کوئی اچھی نظم لکھنی ہوتی ہی یا علمی یا ادبی بحث آپڑتی ہی تو سادہ زبان کا نبھانا مشکل ہوجاتا ہی۔ محض زبان کا آسان ہونا کافی نہیں۔ اس میں جان، اثر اور لُطف بھی ہونا چاہیے۔ اور یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ایسی زبان صرف کامل ادیب ہی لکھ سکتے ہیں ورنہ ایسی تحریر سے کیا فائدہ جو سپاٹ، بے مزہ اور بھدّی ہو۔ دوسرے ہر ایک کا طرزِ تحریر الگ ہوتا ہی۔ کسی کا کوئی رنگ ہی اور کسی کا کوئی ڈھنگ یہ ہر ایک کے مزاج اور افتادِ طبیعت پر منحصر ہی۔ ہم کسی کو مجبور نہیں کرسکتے کہ یوں نہیں یوں لکھو؛ اگر مجبور کریں بھی تو ممکن نہیں۔ وہ نیا ڈھنگ تو کیا اختیار کرے گا اپنا بھی بھول جائے گا۔ میرے کہنے کا منشا یہ ہی کہ یہ جو آج کل چاروں طرف "آسان آسان" کا پرچار کیا جارہا ہی مجھے تو یہ کچھ بے جا سا معلوم ہوتا ہی۔ لفظ کوئی بے جان چیز تو ہی نہیں کہ جہاں چاہا اٹھایا رکھ دیا۔ اس کے گنوں کے پرکھنے والے مشّاق ادیب ہی ہوسکتے ہیں۔ کسی اعلیٰ درجے کے ادیب یا شاعر کا کلام اُٹھا کر دیکھیے ہر لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہی کہ ایک نگینہ ہی جو اپنی جگہ جڑا ہوا ہی۔ اسے بدل کر کوئی دوسرا لفظ رکھ دیجیے ساری لطافت اور نزاکت خاک میں مل جائے گی۔ علاوہ اس کے آسان اور مشکل اضافی لفظ ہیں یعنی ایک چیز جو مجھے مشکل معلوم ہوتی ہی دوسرا اُسے آسان سمجھتا ہی، جسے میں آسان سمجھتا ہوں وہ دوسرے کے نزدیک مشکل ہی۔ اس سے آسان اور مشکل کی کوئی حد مقرر نہیں ہوسکتی۔ یہ ذوق کی بات ہی اور ادب میں یہی منزل بڑی کٹھن ہی۔ وہاں آسان اور مشکل کا

کوئی سوال ہی نہیں ہوتا۔ وہاں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ لفظ موقع اور محل کے مناسب ہے یا نہیں۔ اگر آسان لفظ بھی بے محل آگیا تو ایسا ہی بُرا ہے جیسا بے موقع مشکل لفظ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بیان پیچیدہ اور اُلجھا ہُوا نہ ہو۔ سادگی اور آسانی کے یہی ایک معنی ہو سکتے ہیں۔

گاندھی جی، بابو راجندر پرشاد اور ان کے ساتھیوں نے اس بات کا اعلان کیا ہے کہ ہندی اور ہندستانی میں سنسکرت لفظ ملانے کی اس لیے ضرورت ہے کہ اُسے بنگال اور جنوبی ہند کے لوگ سمجھ سکیں۔ ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ جب بنگال اور جنوبی ہند میں جائیں تو ایسی ہی سنسکرت ملی زبان میں بات چیت یا تقریر کریں اور جب صوبہ سرحد اور پنجاب میں جائیں تو فارسی عربی ملی زبان میں تو ایسی صورت میں ہندستان کی ایک مشترکہ زبان کہاں رہی جس کے لیے یہ سب جتن کیے جا رہے ہیں؟ اور عجیب بات یہ ہے کہ اس سنسکرت ملی ہی زبان کی وجہ سے جنوبی ہند والے ہندی یا ہندستانی کی سخت مخالفت کر رہے ہیں۔ ان کو بدگمانی ہے کہ ہندی کے حیلے سے سنسکرت زبان پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور ہم ان کی زبان اور کلچر کو مٹانا چاہتے ہیں۔

ہماری زبان اگر زندہ زبان ہے تو اس میں نئے نئے الفاظ آتے ہی رہیں گے خواہ وہ کسی زبان کے ہوں۔ اس سے کوئی زندہ زبان نہیں بچ سکتی لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جو لفظ مدت سے رائج چلے آ رہے ہیں انھیں خارج کر دیں اور ان کی جگہ ڈکشنریوں میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے بے ڈول، بے ڈھنگے اور کرخت الفاظ داخل کر دیں جن کے ادا کرنے میں زبان کئی کئی قلابازیاں کھائے اور کانوں کے پردے پھٹنے لگیں۔ جو لفظ پہلے سے رائج ہیں اور ہماری زبان میں گھل مل گئے ہیں خواہ کسی زبان کے ہوں وہ اب ہمارے ہیں، غیر نہیں۔

انھیں غیر سمجھ کر نکالنا سراسر حماقت ہی۔ جو ایسا کرتے ہیں وہ اپنی زبان کے دوست نہیں، دشمن ہیں۔

نئے لفظوں کے داخلے میں بھی زبان کی فطرت اور ذوق کو بڑا دخل ہی۔ اندھا دُھند اور زبردستی لفظ داخل نہیں کیے جا سکتے۔ جو بندھ گیا سو موتی، جو کھپ گیا وہ ہمارا اور جو نہیں کھپا وہ سو غیروں کا غیر۔

ہمار گورنمنٹ نے ایک ہندستانی کمیٹی بنائی ہی اور ہندستانی زبان کی گریمر، لغت اور مدرسوں کے لیے ریڈریں لکھوانی تجویز کی ہیں۔ ابتدائی جماعتوں کے لیے ریڈریں اس زبان میں لکھنا تو کچھ مشکل نہ ہوگا لیکن اونچے درجوں کے لیے جہاں زبان کی ادبی شان بھی رکھنی ضروری ہوتی ہی، کتابیں لکھنے میں مشکل پڑے گی۔ اس سے زیادہ مشکل اصطلاحات کے بنانے میں ہوگی۔ اس کا انتظار کرنا چاہیے اگر اس نے بیچ کا کوئی ایسا راستہ نکال لیا جو مقبول ہو سکے تو یہ اس کی بڑی جیت ہوگی، کم سے کم آپس کی بات چیت اور کاروبار کے لیے بہت کارآمد ہوگی اس کے بعد اگر کوئی مجھ سے پوچھے گا کہ ہندستانی زبان کسے کہتے ہیں تو میں اس کے جواب میں یہ کہوں گا کہ جس زبان میں میں نے آج تقریر کی ہی یہی ہندستانی ہی۔

ہماری تنقید کے لیے دو جملے دیے گئے ہیں۔ ایک جملہ یہ ہی:-

"فیڈرل لیجس لیچر کے لیے فہرست رائے دہندگان تیار کرانے کے سلسلے میں جو ابتدائی کارروائی کی جائے گی، اس کے بارے میں سر این این سرکار لا ممبر نے آج اسمبلی میں روشنی ڈالی۔" اس جملے میں اگرچہ فیڈرل لیجس لیچر، لا ممبر اور اسمبلی کے لیے انگریزی لفظ استعمال کیے گئے ہیں، لیکن جملے کا مطلب صاف سمجھ میں آتا ہی۔ روشنی ڈالنا انگریزی محاورے کا ترجمہ ہی۔ لیکن اب "روشنی ڈالنا" اور "روشنی پڑنا"، اُردو میں استعمال ہونے لگے ہیں اور ان کا مفہوم کسی دوسرے

لفظ سے اس خوبی سے ادا نہیں ہوتا۔ جس طرح پہلے فارسی محاوروں کے ترجمے داخل ہوگئے تھے اب بعض انگریزی محاوروں کے ترجمے داخل ہو رہے ہیں۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں بشرطیکہ زبان میں کھپ جائیں۔ اس سے زبان میں وسعت ہوتی ہے۔

دوسرا جملہ یہ ہے۔

"سنیکت پرانتیہ دیوستھا پکا پریشد میں ایک پرشن کا اُتر دیتے ہوئے نیائے منتری ڈاکٹر کاٹجو نے اُن ادیوگ دھندوں کی سوچی دی جن کی اُنتی کے لیے سرکار نے سہائتا دینا سویکار کیا ہے۔"

اس جملے میں سنسکرت لفظوں کی بھرمار ہے اور مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ ہماری زبان نہیں۔ یہ سراسر بناوٹی زبان ہے۔

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu Series No. 124.

KHUTBAT-I-ABDUL HAQ

A COLLECTION
OF
DR. MAULVI ABDUL HAQ'S
MEMORABLE SPEECHES

Published by

The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India),
DELHI

1939

انجمن کی چند نئی مطبوعات

معلوماتِ سائنس اِس کتاب میں سائنس کے نہایت اہم مسائل یعنی ٹیلیفون، گراموفون، موٹر، ہوائی جہاز، لاسلکی، ریڈیو وغیرہ کو نہایت سلیس زبان میں پیش کیا گیا ہی متعلقہ مضامین کی وضاحت کے لیے متعدد تصاویر اور بلاک بھی دیے گئے ہیں حجم دو سو صفحوں سے زاید قیمت مجلّد (عا) غیر مجلّد (عہ)

ہماری نفسیات E. A. MANDER کی کتاب Psychology for Every Man and Woman کا ترجمہ ہی اس میں نفسیات کے مختلف پہلوؤں پر خوب دل چسپ بحث کی گئی ہی قیمت مجلّد ایک روپیہ چار آنے (عہ) غیر مجلّد ایک روپیہ (عہ)

انتخابِ وحید وحید اکبر الہ آبادی کے اُستاد تھے اور اپنے زمانے کے مشہور شاعر تھے! ان کا کلام اب تک نہیں شایع ہوا تھا یہ پُرگو شاعر تھے اور ان کا کلام دو ضخیم جلدوں میں ہی۔ انجمن نے بڑی کوشش سے اسے دستیاب کیا اور اب اُس کا انتخاب شایع کیا ہی۔ اُمید ہی وحید کے کلام کے مشتاق اس کی ضرور قدر کریں گے قیمت مجلّد (عہ) غیر مجلّد (عہ)

شکنتلا یہ کالی داس کی مہا تصنیف ہی۔ اس کا ترجمہ دنیا کی تمام شایستہ زبانوں میں ہوچکا ہی۔ اردو میں بھی اِس کا وجود ہی لیکن مسخ صورت میں۔ اب پہلی بار راست سنسکرت سے سید اختر حسین صاحب رائے پوری نے اردو میں ترجمہ کیا ہی اور اس امر کا التزام کیا ہی کہ کالی داس کی خوبیوں کو قایم رکھا جائے حجم ۱۴۶ صفحات قیمت مجلّد (عہ) غیر مجلّد (عہ)

اندرونِ ہند نامور تُرکی خاتون خالدہ ادیب خانم کی جدید تصنیف Inside India کا ترجمہ ہی جو مولوی سیّد ہاشمی صاحب نے بہت فصیح اور سلیس زبان میں کیا ہی۔ انھوں نے مختلف یونیورسٹیوں میں لکچر دیے اور انھیں اِس ملک کے دیکھنے اور یہاں کے نامور اصحاب سے ملنے کا موقع مِلا۔ اِن کے مشاہدات اور خیالات پڑھنے کے قابل ہیں۔ بہت دل چسپ کتاب ہی۔ حجم ۴۳۶ صفحات قیمت مجلّد تین روپے چار آنے (سہ) غیر مجلّد تین روپے (سہ)

انجمنِ ترقیِ اُردو (ہند) دہلی

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu Series No. 124.

KHUTBAT-I-ABDUL HAQ

A COLLECTION
OF
DR. MAULVI ABDUL HAQ'S
MEMORABLE SPEECHES

Published by

The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India),
DELHI

1939